جگن ناتھ آزاد

جنوبی ہند میں دو ہفتے

دہلی کتاب گھر، دہلی

جنوبی ہند میں دو ہفتے

جنوبی ہند میں دو ہفتے

جگن ناتھ آزاد

دہلی کتاب گھر، دہلی

طبع اوّل
ایک ہزار

قیمت
ایک روپیہ

پرنٹر گلاب چند کپور اینڈ سنز دہلی
پبلشر دہلی کتاب گھر دہلی

اُردو ایسوسی ایشن

گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس

کے نام

جس کی دعوت پر مجھے جنوبی ہند میں

سیر و سیاحت کرنے اور اُردو کی

رفتار و ترقی کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔

بہ حرفے می تواں گفتن تمنّائے جہانے را

من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

اقبال

جنوبی ہند میں دو ہفتے

گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس کی اردو ایسوسی ایشن کے وائس پریزیڈنٹ سیّد حامد اشرف کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ ہم لوگ کالج میں ایک مشاعرہ منعقد کر رہے ہیں۔ آپ بھی اس میں شرکت کیجئے۔ دعوت نامے کو دیکھ کر تعجب ہوا ـــــ مدراس اور مشاعرہ ـــــ آخر ان دونوں میں کیا تعلق ہے۔ مدراس کے متعلق اتنا تو میں جانتا تھا کہ یہ کسی زمانے میں جنوبی ہند کے لئے اردو کے مرکز کا کام دے چکا ہے۔ اور اب بھی ڈاکٹر عبد الحق پرنسپل پریزیڈنسی کالج کی بدولت وہاں اردو کا نام زندہ ہے۔ لیکن یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ مدراس میں ایسا مشاعرہ بھی ہو سکتا ہے جس میں شرکت

کے لئے دلی سے کسی کو دعوت دی جائے۔

اسی کشمکش کے عالم میں میں نے اپنے آپ کو مشاعرہ میں شرکت کے لئے آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر بار اس خیال کے تحت دعوت قبول کرنے کا ارادہ ترک کر دیا کہ مدراس میں اردو کا کلام کون سنے گا اس دوران میں اشرف صاحب کے ساتھ خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔ آخر انھوں نے ایک خط میں لکھا:۔

"مشاعرے کے انتظامات بہ فضلِ خدا جاری ہیں۔ انشاءاللہ یہ مشاعرہ نہایت کامیاب ہوگا۔ اور آپ جنوبی ہند سے ایک یاد لے کر واپس ہوں گے"

اب اس خط کے بعد شریک نہ ہونے کا فیصلہ کرنا ایک غلطی تھی چنانچہ میں نے اپنے آنے کی اطلاع ان کو دے دی۔ اور ساتھ ہی اپنے دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر محی الدین قادری زور کو بھی خط لکھ دیا کہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے مدراس جا رہا ہوں۔ آپ سے ملاقات کی تمنا ایک مدت سے ہے اگر آپ ان ایام میں حیدرآباد میں ہوں تو میں رستے میں ایک آدھ دن کے لئے اتر جاؤں۔ تاکہ آپ سے اور سہروردی صاحب سے ملاقات ہو سکے۔

ڈاکٹر زور نے کچھ اس محبت بھرے انداز سے میری اس تجویز کا خیر مقدم کیا کہ میرا حیدر آباد جانے کا ارادہ پختہ تر ہو گیا۔ اور میں ۲۹ اکتوبر کو دلی سے روانہ ہو گیا۔

گاڑی شام کے سات بجے چلی۔ میں دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ نو بجے کے قریب سو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو ریل بھوپال کے ہرے بھرے میدانوں میں سے گزر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں بھوپال کا اسٹیشن آگیا۔ یہاں ایک صاحب ہمارے ڈبے میں داخل ہوئے۔ اور میرے قریب آکر بیٹھ گئے۔ ریل چلی تو انھوں نے اپنا بیگ کھولا۔ اور اس میں سے پانچ سات رسائل اور کتابیں نکالیں۔ دو ایک رسائل انگریزی کے تھے۔ دو کتابیں ہندی کی اور ایک اردو کی۔ یہ صاحب شکل وصورت اور لباس سے مراٹھی نظر آتے تھے میں چاہتا تھا کہ ان سے بات کروں۔ لیکن وہ محو مطالعہ تھے اور ان کے مطالعہ میں مخل ہونا میں نے مناسب نہ سمجھا۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنے بیگ سے کچھ پھل نکالے۔ اور مجھے بھی شریک ہونے کو کہا۔ میں تو خود ان سے بات کرنے کا تمنائی تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے مراٹھی ہونے کے متعلق میرا خیال صحیح ہے

انھوں نے اپنا نام وی نارائن راؤ بتایا۔ وی نارائن راؤ انگریزی۔ گجراتی ہندی اور اردو یہ چاروں زبانیں جانتے تھے۔ اردو کے متعلق کہنے لگے کہ میری واقفیت بہت کم ہے۔ اس زبان سے میری دل چسپی منشی پریم چند کے افسانوں سے شروع ہوئی۔ اور اب بھی ادب کی تمام اصناف میں میں افسانوں ہی کو پسند کرتا ہوں۔ اردو میں مجھے کرشن چندر اور احمد عباس کے افسانے بہت پسند ہیں۔ کبھی کبھی نظم کا مطالعہ بھی کر لیا کرتا ہوں۔ لیکن زیادہ لگاؤ مجھے گجراتی اور انگریزی سے ہے۔ اردو کے متعلق میں نے پوچھا کہ ان دنوں آپ کے زیر مطالعہ کون سی کتاب ہے تو انھوں نے ساتھ رکھی ہوئی کتاب مجھے اٹھا دی۔ یہ رامانند ساگر کا ناول تھا۔ "اور انسان مر گیا" اس کے بعد بیگ سے ایک اور اردو کی کتاب نکالی اور کہا یہ ایک دوست نے مجھے پڑھنے کو دی ہے۔ لیکن مجھے اتنی اردو نہیں آتی کہ نظم کو اچھی طرح سے سمجھ سکوں۔ یہ کتاب اردو کے قریب قریب ایک گم نام شاعر راج بلدیو کا مجموعۂ کلام تھا "ناقوس"۔ میں اس کتاب اور اس کے مصنف کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن نارائن راؤ سے اس موضوع پر بات نہ ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ اردو شاعری کا مطالعہ ان کا بہت کم تھا۔ میں

یہ کتاب ایک بار پہلے پڑھ چکا تھا۔ اس کتاب کے مصنف کا شمار اردو کے ان شعراء میں ہے جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

۱۹۳۶ء کے لگ بھگ راج بلدیو راج کا نام لاہور کے ادبی حلقوں میں جس تیزی سے چمکا تھا اسی تیزی سے دو ایک برس بعد دنیائے ادب سے محو ہو گیا۔ میں نے اس کتاب کے ورق اُلٹے اور اس کے اکثر حصوں میں مجھے وہی تازگی اور حرارت نظر آئی جو آج سے پانچ سات برس پہلے اس شاعر کے کلام میں محسوس ہوتی تھی۔ میں اس راز کو اب تک نہیں سمجھ سکا کہ بعض بہت اچھا کہنے والے شاعر اچانک اس طرح خاموش کیوں ہو جاتے ہیں کہ پھر اُن کا کوئی مصرع یا کوئی شعر سننے میں نہیں آتا۔ یہ مجموعۂ کلام کوئی ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس میں بہت حسین و جمیل اشعار موجود ہیں۔ یہاں راج بلدیو کی شاعری پر مجھے کوئی ادبی بحث چھیڑنا یا تبصرہ کرنا مقصود نہیں صرف تفننِ طبع کے لیے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

ڈھلتا نہیں زبان کے سانچے میں ہر خیال
نغمے تڑپ رہے ہیں مری بانسری سے دور

مجھے بے نیازِ الم نہ کر مجھے بے نصیبِ ستم نہ کر　　مرے غم کی لذّتِ جاوداں مری زندگی کی بہار ہے

بے سُرخی و بے رنگ ہے افسانۂ ہستی　　جب تک کہ لہو دل کا نہ اشکوں میں ہو شامل

پھولوں کے نام اہلِ چمن کو رہیں نصیب　　خنداں ہیں خار ہائے بیاباں مرے لئے

میں جی رہا ہوں تیرا سہارا لئے بغیر　　اک زہر پی رہا ہوں گوارا کئے بغیر

کیا زندگی ہے اہلِ گلستاں کی زندگی　　گُل ہنس رہے ہیں چاکِ گریباں سیئے بغیر

برقِ چمن حدودِ چمن سے نکل کے دیکھ　　تاریک ایک اور بھی گھر ہے دیئے بغیر

اے راز راس آ نہ سکی محفلِ حیات　　ہم آ گئے تھے کس کی اجازت لئے بغیر

آج جو ایثار کا جذبہ ہے پروانوں کے پاس

تھی کبھی یہ دولتِ بیدار انسانوں کے پاس

عقل ہے اک آستیں کا سانپ فرزانوں کے پاس

بے خودی کتنی بڑی دولت ہے دیوانوں کے پاس

سفینے کھے رہا ہوں میں تلاطم خیز طوفاں میں　　لیے جاتا ہے مجھ کو شوق میرا ناخدا ہو کر

نارائن راؤ سے میں نے پوچھا آپ اردو کے اچھے شعرا کے نام سے تو واقف ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ غالب اقبال اور جوش کا نام میں نے بہت سنا ہے۔ اور میری بڑی آرزو ہے کہ میں ان شاعروں کے کلام کا مطالعہ کروں۔ لیکن جب تک ان کے انگریزی یا گجراتی ترجمے مجھے دست یاب نہ ہو سکیں میں ان کے کلام سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ میں نے انھیں بتایا کہ اقبال کی دو فارسی مثنویوں۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کا تو انگریزی ترجمہ موجود ہے۔ لیکن غالب اور جوش کے ترجمے میری نظر سے نہیں گزرے غالب کا ایک ترجمہ اردو اکیڈمی لاہور کا چھپا ہوا مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا لیکن وہ ترجمہ ہر اعتبار سے ناقص تھا اس لیے میں نے اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

نارائن راؤ بہت وسیع المطالعہ شخص تھے۔ انھوں نے ادب کے مختلف اصناف پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیر و سیاحت بھی انھوں نے بہت کی تھی۔ کشمیر اور نیپال کا انھوں نے خاص طور پر ذکر کیا۔ کشمیر کے متعلق تو ہر

روز اخبارات میں پڑھنے کے باعث بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا اور چند دن کے لئے مجھے کشمیر جانے کا اتفاق بھی ہو چکا تھا۔ لیکن نیپال کے متعلق میری واقفیت بہت کم تھی۔ اور چین کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر نیپال کے متعلق کچھ جاننا ضروری بھی تھا۔ لہذا میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں چین کی سیاسیات کا نیپال پر کیا اثر پڑے گا۔ وہ کہنے لگے کہ اس دور میں کسی ملک کی سیاسی صورت حال کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس کی اقتصادیات کا جائزہ لینا چاہیئے کیوں کہ اس زمانے میں سیاسیات کی باگ ڈور اقتصادیات کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ نیپال کی اقتصادی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اقتصادی طور پر نیپال کے لوگ بہت پس ماندہ ہیں۔ ان کا خاص پیشہ زراعت ہے۔ پہاڑ کی ڈھلان پر جو مکی اور باجرے کی کاشت ہوتی ہے۔ دریاؤں کی وادیوں میں چاول پیدا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں یہ امر نہایت ہی افسوس ناک ہے کہ حکومت کی بے توجہی کے باعث زمین کا ایک کافی حصہ جو اچھے خاصے مصرف میں لایا جا سکتا ہے بے کار پڑا ہے۔ نہریں اس دیس میں بالکل مفقود ہیں اور کھٹمنڈو کی وادی میں کھیتی باڑی ہل کے عوض بیلچوں اور کدالوں

سے ہوتی ہے۔

نیپال کے نظامِ حکومت میں جاگیرداری کہیں دکھائی نہیں دیتی لیکن اِس سے بھی بدتر چیز جسے "بِترا" کہتے ہیں موجود ہے۔ زمین کے مالک کو زمین پر ہر قسم کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ حتّٰی کہ حکومت اکثر اوقات زمین کے ملنے سے بھی محروم رہتی ہے۔ مزارعین کو مالک کے خلاف حکومت کے سامنے اپیل کرنے کا کوئی اختیار نہیں اور وہ ہر طرح مالک کے رحم پر ہوتے ہیں۔ اس نظام کا تاریک ترین پہلو یہ ہے کہ زمینوں کے مالک اکثر شاہی خاندان کے افراد ہوتے ہیں۔

نیپال کی اقتصادی زندگی کا ایک مضر پہلو یہ ہے کہ یہاں زرعی جمود کے باعث بے روزگاری روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہ لوگ روزگار کی تلاش میں اکثر اپنا گھربار چھوڑ کر ہندوستان آجاتے ہیں۔ چونکہ حکومت نے ابھی اس طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے لہٰذا یہ لعنت بڑی سرعت پھیل رہی ہے۔ اگر ملک میں صنعت و حرفت کی جانب توجہ کی جائے تو لوگوں کی ایک خاصی تعداد کو روزگار مہیّا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حکومت دقت قدامت پرستی کی زنجیروں میں کچھ اس طرح گرفتار ہے کہ صنعتی قسم کی بجائے

بر عمل پیرا ہونے کا خیال ہی اُسے نہیں آتا۔ اور زیادہ بُری بات یہ ہے کہ ترائی کے علاقے میں جو ایک آدھ کارخانہ موجود ہے اس سے بھی خود نیپال نہیں بلکہ باہر کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ شاہی خاندان کے افراد اگرچہ بہت دولت مند ہیں لیکن وہ بھی اپنا سرمایہ ملک کی صنعتی ترقی کے لئے استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنا سرمایہ غیر ملکی صنعتوں میں لگاتے ہیں۔ اور قوم کی ترقی سے بالکل آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔

بیرت نگر میں پٹ سن کے کچھ کارخانے موجود ہیں۔ جن میں سرمایہ اور محنت ہندوستانیوں کی ہے۔ یہ کارخانے خاصے منافع پر چل رہے ہیں ان کے علاوہ سگرٹ اور دیاسلائی کے بھی دو کارخانے ہیں۔ کھٹمنڈو اور اس کے گرد و نواح میں آٹا پیسنے کی مشینیں اور تیل نکالنے کے کارخانے بھی موجود ہیں کھٹمنڈو میں سڑکیں پختہ ہیں اور یہاں اکثر کاریں اور لاریاں چلتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ابھی تک حکومت نے کھٹمنڈو کو ریل یا موٹر کے ذریعہ سے بھیم پھیدی کے ساتھ جو نیپال کی سرحد پر آخری چوکی ہے اور ہندوستان کے ساتھ ٹرانسپورٹ کے ذریعے سے ملی ہوئی ہے ملانے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ فقط چوبیس میل تک ایک ہلکی سی ایک ریل ہے جو

رکسول سے امریک گنج کے درمیان چلتی ہے۔ یہ ریل ۱۹۳۰ء میں بنائی گئی تھی۔

یہاں کے عوام کا افلاس ناقابلِ بیان ہے۔ اسّی فی صدی لوگوں کو تو پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ تعلیم کا معیار بھی بہت پست اور ناقص ہے۔ سارے نیپال میں کوئی اخبار نہیں اور نہ کوئی پبلک لائبریری ہی پائی جاتی ہے۔ ملک بھر میں چار ہائی اسکول ہیں۔ دو مڈل اسکول ہیں اور ایک کالج ہے جس میں سائنس کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ایشیائی ممالک میں تجارتی اعتبار سے نیپال کی صنعت ختم ہو گئی تھی۔ نیپال چاول۔ عمارتی لکڑی۔ نارنگیاں گھی اور پٹ سن باہر بھیجتا ہے اور مشینری۔ کپڑے۔ دیگر ضروریاتِ زندگی خوشبوئیں اور عیش و عشرت کا سامان باہر سے منگواتا ہے۔

مؤرخین کا کہنا ہے کہ آج سے سو سال پہلے نیپال کی اقتصادی حالت اتنی خستہ نہیں تھی جتنی اب ہے۔ انگریز سیاحوں کا بیان ہے کہ کچھ مدت پہلے نیپال کھڈیوں کا گھر تھا۔ اور گھر گھر میں کھڈیاں لگی ہوئی تھیں

اپنی ضروریات کے مطابق نیپال اپنے لئے کپڑا خود تیار کرتا تھا۔ کپاس بھی اتنی ہوتی تھی کہ کھڈیاں سارا سال چلتی رہتی تھیں۔ اور نیپال میں تیار کئے ہوئے کپڑے تبت اور ہمالیہ کے دیگر علاقوں میں فروخت ہوتے تھے۔

بدقسمتی سے آج یہ صورت حال نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں کہ کپاس کے ہرے بھرے کھیت نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ بلکہ کھڈیوں کی صنعت کا زمانہ بھی ایک بھولی بسری کہانی بن کر رہ گیا ہے اب اگرچہ بعض حلقوں میں اس کو دوبارہ جاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن برطانوی کپڑے کی درآمد کے مقابلے میں اس صنعت کا دوبارہ جاری ہونا قریب ناممکن نظر آتا ہے۔

ہندوستان کی کرنسی سے ملتا جلتا نیپال کا اپنا کرنسی کا انتظام ہے لیکن یہ انتظام اب اتنا بوسیدہ ہو چکا ہے کہ اس میں خاطر خواہ تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ ایک بار تو ایسا بھی ہوا تھا کہ ہندوستانی کرنسی کے مقابلے میں نیپال کی کرنسی کی قیمت گر گئی تھی۔ لیکن دوسری جنگ کے دوران میں صورت حال سنبھل گئی۔ اور اب نیپالی روپیہ اپنی پرانی

قیمت بڑھ واپس آگیا ہے۔ ملک میں سونا چاندی تقریباً نایاب ہے۔

اس وقت نیپال کا تقریباً تین کروڑ روپیہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے بینکوں میں پڑا ہے۔ تجارت میں جو خسارہ ہوتا ہے اس کی کمی یوں پوری کی جاتی ہے کہ ترائی کے علاقے کی سرکاری آمدنی کا دو تہائی کلکتہ کے بینکوں میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

نیپال بیرونی دنیا سے بالکل الگ تھلگ اور ہر اعتبار سے کٹا ہوا ہے حتیٰ کہ نیپال اور ہندوستان کے درمیان تار کا انتظام بھی نہیں۔ بیرگنج کے سرحدی شہر اور کھٹمنڈو کے درمیان ٹیلیفون کی لائن موجود ہے۔ باقی تمام شہر اور علاقے ذرائع رسل و رسائل سے محروم ہیں۔ ڈاکخانہ ہے لیکن اس کا انتظام بہت ناقص ہے۔ آمد و رفت کے لئے مشرق سے مغرب تک ایک سڑک جاتی ہے۔ جو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پیغام رسانی کا واحد ذریعہ ہے۔

نیپال دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں۔ چنانچہ بیرونی دنیا کے لئے یہ ملک ایک بند لفافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

گاڑی کی رفتار اب مدھم ہو چلی تھی۔ اگلا اسٹیشن اٹارسی کا تھا

نارائن راؤ کو یہیں اُترنا تھا۔ اُنھوں نے نیپال کے متعلق اپنی بات چیت یہیں ختم کی۔ سامان سمیٹا اور گاڑی رکی تو مسکراتے ہوئے "آداب عرض" کہا اور اُتر گئے۔

اُن کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک ہندوستان میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا۔ مراٹھیوں کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ لوگ اُردو نہیں جانتے ہوں گے لیکن نارائن راؤ کی ملاقات نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ نارائن راؤ نے ساری بات چیت اُردو میں کی تھی۔ اور اپنا مافی الضمیر پوری طرح سے مجھ پر واضح کر دیا تھا۔ اصل میں اُن کی گفتگو اتنی دل چسپ تھی کہ میں اُن سے یہ پوچھ ہی نہ سکا کہ مہاراشٹر میں اُردو زبان کی کیا کیفیت ہے اور وہاں ہندوستان کی اس زبان کا کیا مستقبل ہے۔

ُردو کے عروج اور زوال کی ساری تصویر اس وقت ۔۔۔ ہوں میں پھر رہی تھی۔ ہندوستان میں امیر خسرو کی شاعری۔ دور ۔۔۔ بہمانی میں اُردو کی ابتدا۔ انگریزوں کی آمد۔ زبان کی تعمیر میں فورٹ ولیم کا حصہ یو۔پی کے انگریز گورنر کی بدولت صوبے میں اُردو اور ہندی کے جھگڑے کی ابتدا۔

اُردو کی تعمیر میں مسلمانوں کے ساتھ عظیم ہندو فن کاروں کا حصّہ۔ آزادی کی جدوجہد میں اُردو کی خدمات۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے جھگڑے میں اُردو کی پوزیشن۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کے چودہ نکات میں اُردو کی موجودگی۔ ملک کی تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں اُردو کی کیفیت اور پھر ہندوستان میں ایشیا کی اتنی بڑی پروگریسو زبان کا یہ انجام کہ ع

بھٹکتی پھر رہی ہے یوسفِ بے کارواں ہو کر

میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا کہ اس ملک میں اس زبان کا انجام کیا ہوگا۔ اُمید اور مایوسی دونوں دل میں رقص فرما تھیں۔ کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ جناح صاحب نے اُردو کو مسلم لیگ کے چودہ نکات میں شامل کر کے ایک بڑی غلطی کی تھی۔ کیوں کہ اس بات نے مخالف طبقے کے دل میں یہ خیال بٹھا دیا تھا کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ حال آنکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی زبان مذہبی حیثیت سے اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ عربی ہے۔ کیوں کہ یہی قرآن کی زبان ہے اور اسی میں مسلمانوں کے ہادیؐ نے نوعِ انسان کو اپنا پیغام دیا۔

پھر یہ خیال آتا تھا کہ جناح صاحب نے تو علم و ادب کے نقطۂ نگاہ

سے یہ غلطی کی ہی تھی ہندوستان کے اُس آزادی پسند طبقے کے دل و دماغ کو کیا ہو گیا ہے جو اپنے آپ کو اس ملک کے عظیم تہذیب و تمدن کا وارث سمجھتا ہے۔ کیا اُردو زبان اور اُردو ادب ہندوستان کے تہذیب و تمدن کا جزو نہیں ہے۔ کیا یہ پھول اسی گلستاں کی خاک سے اور اسی کی آب و ہوا میں پیدا نہیں ہوا؟ کیا یہ ہندوستان کی مشترکہ قومیت کا ایک زندہ ثبوت نہیں ہے؟ کیا اس پودے کو ہندو اور مسلمانوں نے مل کر اپنے خون جگر سے نہیں سینچا؟ کیا اُردو کے ختم ہونے سے ہندوستان کی تمدنی خوبصورتی میں نمایاں کمی واقع نہیں ہو جائے گی؟ کیا یہ اس وقت بھی ہندوستان کے متعدد صوبوں کی عام بول چال کی زبان نہیں ہے؟ اگر پاکستان نے اُردو کو اپنی سرکاری زبان تسلیم کر لیا ہے تو کیا ہم پر یہ فرض عائد آتا ہے کہ ہم اس زبان کی مخالفت کریں؟ جس ملک کی یہ زبان ہے کیا اس پر اس کی بقا اور ارتقا کے لئے کوئی فرض لازم نہیں آتا؟ جب اُردو پاکستان کے کسی صوبے کی بول چال کی زبان نہیں تو اس کی حفاظت اور اس کی ترقی کا فرض کس ملک پر عائد ہوتا ہے؟

اس سوچ میں ریل میلوں آگے نکل گئی۔ کچھ وقت میں نے پڑھنے

میں گزارا کچھ مناظر دیکھتے ہیں۔ شام کے سات بجے گاڑی واردھا پہنچی۔ وہی واردھا جو مدّتوں ہندوستان کی جنگِ آزادی کے قافلہ سالار کا مسکن رہا ہے۔ وہی واردھا جہاں ہندوستان کے بہترین دل و دماغ متعدد مرتبہ چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیئے جمع ہوئے وہی واردھا جہاں مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے مل کر ہندوستان کے نئے نظامِ تعلیم کی بنیاد رکھی جسے آج واردھا کی تعلیمی اسکیم کہا جاتا ہے۔ آج یہ واردھا ایک نجدِ بے قیس ——— یا ایک محملِ بے لیلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مہاتما گاندھی کا خیال آتے ہی جوش ملیح آبادی کی اس نظم کے یہ اشعار ذہن میں آگئے جو اس عظیم فن کار نے اس عظیم رہنما کی وفات پر کہی تھی ؎

اے امیرِ کاروانِ پختہ کارانِ وطن
اے گدائے تاج دار تاج دارانِ وطن

اے امیدِ ہمّتِ ناکامگارانِ وطن
اے ہلاکِ شیوۂ خوں ریز یارانِ وطن

اے شکارِ کج روان و کورمغزاں السلام

السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

تو امینِ مرحمت آئینۂ ایثار تھا
صحّتِ افکارِ انساں کے لئے بیمار تھا

برہمن کا چارہ فرما شیخ کا غم خوار تھا
نورِ رواداری کا دیوتا امن کا اوتار تھا

السلام اے کعبۂ و کاشی کے درباں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

جادۂ حق پر درخشاں ہیں ترے نقشِ قدم
پر فشاں ہے آسمانِ عدل پر تیرا علم

اے حسین ابن علی کے پیرو قدسی حشم
اے یزیدِ عصرِ نو کے کشتۂ مشقِ ستم

اے صلیبِ تازہ کے عیسیٰ دوراں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اے گلِ افسردۂ بستانِ حق و راستی
اے سرودِ رفتۂ بزمِ نشاطِ زندگی

اے شبِ مسروقۂ زلفِ درازِ آگہی
اے چراغِ مردۂ محرابِ امن و آشتی

اے متاعِ بردۂ گیتا و قرآں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

تو ہی اک دانائے کامل بزمِ نادانی میں تھا
روشنی کا تو منارہ بحرِ طوفانی میں تھا

تیرے دم سے زمزمہ گنگا کی جولانی میں تھا
نغمہ تجھ سے کوثر و تسنیم کے پانی میں تھا

اے عزیزِ ہندو و فخرِ مسلماں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اور میں نہ جانے کتنی دُور تک ان اشعار کو گنگناتا چلا گیا۔

اگلی صبح ریل حیدرآباد جا پہنچی وہاں اسٹیشن پر ڈاکٹر زور، خواجہ حمید الدین شاہد اور حضرت ضامن بخاری موجود تھے۔ ڈاکٹر زور کی تصویر ہم لوگ "آج کل" میں شائع کر چکے تھے۔ لہٰذا انھیں پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ ڈاکٹر زور نے مجھے کس طرح پہچان لیا۔ جوں ہی میں گاڑی سے اُترا وہ میری جانب بڑھے اور بولے "آپ ہیں جگن ناتھ آزاد"۔ میں اپنے پہچانے جانے پر بہت متعجب ہوا۔ ڈاکٹر زور نے پروفیسر شاہد اور ضامن صاحب کا تعارف کرایا۔ حضرت شاہد کے نام سے تو میں پہلے ہی سے آشنا تھا۔ ہاں ضامن صاحب کے نام سے شناسائی نہ تھی۔ لیکن ایک دوسرے ذریعے سے جب تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ میرے لئے بالکل اجنبی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آپ محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر کے شوہر ہیں۔ بشیر صاحبہ کا مجموعۂ کلام "آبگینۂ شعر" میں کچھ مدت پہلے دیکھ چکا تھا۔ اور اُن کے کلام کا معترف ہو چکا تھا۔ لہٰذا اسٹیشن کی تینوں ملاقاتیں بیگانوں سے نہیں بلکہ اپنوں سے ہوئیں اور ایک منٹ تک وہیں باتیں کرنے کے بعد ہم لوگ زور صاحب کے دولت کدے کو روانہ ہوئے۔ رستے میں آپ ہر

چھوٹی بڑی عمارت. منظر یا تاریخی مقام کے متعلق مجھے کچھ نہ کچھ بتاتے گئے حتیٰ کہ جب ہم گھر پہنچے تو حیدرآباد کا ایک دھندلا سا نقش میرے دل میں قائم ہو چکا تھا۔

گھر میں ناشتہ کرنے کے بعد شاہد صاحب اور رضامن صاحب تو اپنے اپنے کام کو چلے گئے اور ہم لوگ چادر گھاٹ آرٹس کالج میں پہنچے۔ زور صاحب اسی کالج کے پرنسپل ہیں۔ اسٹاف کے ممبروں سے ملاقات ہوئی۔ مجھے چونکہ پولیس ایکشن کے بعد ریاست میں اردو کی پوزیشن کا مطالعہ کرنے کا شوق تھا اس لئے یہیں سے اس مطالعہ کی ابتدا کی۔

حیدرآباد میں زبان کا مسئلہ بہت ٹیڑھی صورت اختیار کر چکا ہے۔ حیدرآباد کی اپنی علاقائی زبانیں تین ہیں۔ اگر ریاست کو شمالاً جنوباً دو حصوں میں تقسیم کریں تو مشرقی علاقے میں تلنگی کے سوا اور کوئی زبان نظر نہ آئے گی۔ اس زبان کے اثرات مدراس کے بعض سرحدی علاقوں تک چلے گئے ہیں۔ ریاست کا جو علاقہ بمبئی سے ملحق ہے اس میں مراٹھی بولی جاتی ہے۔ جنوبی علاقے کی زبان جس کی حدود میسور سے ملتی ہیں کینڑی ہے۔ لیکن اس علاقے میں کینڑی اپنی ادبی صورت میں نہیں بلکہ دیہاتی صورت

موجود ہے۔ کینڑی کا ادبی اور منجھا ہوا رنگ روپ میسور میں دیکھنے میں آتا ہے۔ ریاست کے اونچے طبقے میں خواہ وہ کسی حصّے کا ہی کیوں نہ ہو انگریزی مستعمل ہے۔ اس کے علاوہ شہروں اور دیہات میں اُردو بڑی بے تکلفی سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ریاست کے اسٹیشنوں پر خوانچے والے اور قلی صاف ستھری اُردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ اسے آپ ہندی کہہ لیں یا ہندوستانی لیکن یہ زبان وہی ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں مستعمل ہے اور جس کی جگہ ہندوستان کی کوئی مصنوعی زبان نہیں لے سکتی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم ہندوستانی ہے۔ پولیس ایکشن سے پہلے اسی کو غالباً اُردو کہتے تھے۔

تو اس صورت حال کے پیشِ نظر ایک طالب علم کے لئے اسکول یا کالج میں آکر یہ فیصلہ کرنا کہ وہ کون سی زبان اپنے مضمون کے طور پر اختیار کرے۔ بہت ہی مشکل مسئلہ ہے۔ ہندی اہلِ ریاست کے لئے ابھی تک ایک بیرونی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس کے لئے فضا پیدا کی جارہی ہے لیکن اس وقت تک صورت یہ ہے کہ وہاں کے ہندی اخبار "ملاپ"

کو بڑی کوششوں کے باوجود ریاست بھر میں ہندی کا کوئی اسسٹنٹ ایڈیٹر نہیں مل سکا۔ اور اخبار کے ایڈیٹر شری یدھ ویر تنہا اس اخبار کو مرتب کر رہے ہیں۔ اس حقیقت کا انکشاف خود شری یدھ ویر کی زبانی ہوا۔ لہٰذا اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ شری یدھ ویر نے بتایا کہ دو چار حضرات دفتر میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کا کام کرنے کے لئے آئے لیکن وہ الفاظ کے صحیح ہجّے بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ سُن کر میں نے کہا کہ پھر آپ کیوں اس بکھیڑے میں پڑے ہیں۔ جو زبان ریاست کی زبان نہیں آپ کیوں اُسے ریاست پر ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کو چاہیئے کہ اپنی ساری توجہ اُردو ملاپ پر مرکوز کریں۔ کیوں کہ مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ہی اس ریاست کی زبان ہے۔ اس پر آپ ہنس پڑے۔ میں منتظر رہا لیکن آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی ایک ایسی درس گاہ ہے جو ہندوستان بھر میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ یہ ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی ہے جس نے اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا۔ اور ڈاکٹر حمید اللہ۔ ڈاکٹر محی الدین اور ڈاکٹر عزیز الدین ایسی شخصیتوں کو پیدا کیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری سے ملنے

کی تمنّا مجھے کشاں کشاں اس یونیورسٹی میں لے گئی۔ انھیں میرے آنے کی اطلاع پہلے مل چکی تھی۔ بڑی محبت سے ملے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آپ نے یونیورسٹی کے ڈین پروفیسر دوراسوامی سے ملایا۔ پروفیسر دوراسوامی ایک مدراسی ہیں۔ اور بہت خوش خلق انسان ہیں۔ وہیں یہ فرمائش ہوئی کہ میں پرسوں یونیورسٹی میں "ہندوستان میں اردو کا مستقبل" کے موضوع پر تقریر کروں۔ اور اپنا کلام سناؤں۔ یونیورسٹی کے اسٹاف اور اردو کے تمام طلبہ سے ملنے کا یہ ایک بہت اچھا ذریعہ تھا۔ چنانچہ میں آمادہ ہو گیا۔

وہاں سے فارغ ہوئے تو پروفیسر شاہد یونیورسٹی لائبریری دکھلانے لے گئے۔ جناب مسعود یزدانی لائبریرین سے ملاقات ہوئی۔ آپ جناب غلام یزدانی ناظم آثارِ قدیمہ کے فرزند ہیں۔ میں جناب غلام یزدانی کے نام سے آشنا تھا۔ اگرچہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی لہذا مسعود صاحب سے مل کر خاص مسرت حاصل ہوئی۔ آپ نے لائبریری کی ایک ایک الماری اور ایک ایک شیلف دکھایا۔ قلمی مسوّدے اس لائبریری میں بڑی بھاری تعداد میں موجود ہیں۔ انھیں تفصیل سے دیکھنے کے لیے کئی دن چاہییں۔

اور ہمارے پاس تو چند لمحات تھے - کیا کیا دیکھتے - تمنا ہی دل میں لے کر واپس آ گئے ع

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے مگر پھر بھی مرے ارمان کم نکلے

اس لائبریری میں ستّر ہزار کتابیں ہیں - اور تیس ہزار کتابیں جو نواب سالار جنگ مرحوم کا عطیہ ہیں ایک اور عمارت میں رکھی گئی ہیں۔ یہ کتابیں عنقریب اس بڑی عمارت میں منتقل کر دی جائیں گی۔

یونیورسٹی میں جو ملاقاتیں ہوئیں اُن میں ایک قابلِ ذکر ملاقات پنڈت ونشی دھر سے ہوئی۔ پنڈت جی ہندی کے پروفیسر ہیں۔ اچھی اردو جانتے ہیں۔ اور ہندوستان میں زبان کے مسئلے کا آپ نے اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ آپ ہندی میں شعر بھی کہتے ہیں۔ اگلے دن کی نشست میں جس کا ذکر میں ابھی کروں گا۔ آپ نے ہندی کلام سنایا جس کے متعلق میری رائے آج بھی یہی ہے کہ یہ اردو کلام ہے۔ لیکن پنڈت جی اسے یقیناً ہندی شاعری کہتے ہوں گے۔ میں حیران ہوں کہ اگر پنڈت ونشی دھر کی شاعری ہندی شاعری ہے تو پھر اردو اور ہندی والوں میں جھگڑا کس بات کا ہے - یہ

شعر غالباً اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے :-

از تعصّب ساغرِ شیخ و برہمن شد جدا
ورنہ در مے خانہ یک ساقی و یک جام است و بس

شام کو چادر گھاٹ آرٹس کالج کے طلبہ اور اسٹاف کے درمیان میچ ہوا جس میں اساتذہ کرام ایک گول سے ہار گئے۔ یہ میچ بہت پُر لطف رہا اور پروفیسر صاحبان کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے میچ کے بعد چائے کی دعوت میں شریک ہوئے۔ اور اکثر نے تو اپنے زورِ بیان سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اگرچہ ہم ایک گول سے ہار گئے ہیں لیکن جیت پھر بھی ہماری ہے۔ کیوں کہ طلبہ تو ہر روز مشق کرتے ہیں اور ہم مدت کے بعد کھیلے۔ دلیل بہت معقول تھی لیکن شکست کو فتح میں تبدیل نہ کر سکی۔

اگلے دن پھر کچھ وقت چادر گھاٹ کالج میں بسر کیا۔ اس تنگ نظری اور کم ظرفی کے دور میں اس کالج کا ماحول دیکھ کر دل کو انتہائی مسرت حاصل ہوئی۔ کالج کے اسٹاف اور طلبہ میں محبت اور یگانگی کا ایک قابلِ تعریف رشتہ نظر آیا۔ زور صاحب کی مصروفیات دیکھیں تو تعجب ہوا کہ کالج کے کام میں اس قدر مشغول اور منہمک رہنے کے باوجود آپ علمی

ادبی اور تنقیدی مضامین کیسے لکھ لیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ کالج کے طلبہ یا اسٹاف کے ممبر کوئی بھی مسئلہ لے کر آپ کے پاس آئیں آپ بڑی توجہ سے سُنتے ہیں۔ اور ایک دفتری یعنی انتظامی انداز سے اس کے ہر پہلو پر سوچ بچار کر کے اس کا حل نکالتے ہیں۔

کالج میں کچھ وقت بسر کرنے کے بعد میں پروفیسر مجید الدین کی معیت میں شہر کی سیر کو نکلا۔ مکہ مسجد۔ چار مینار۔ فتح میدان اور دیگر قابل دید مقامات دیکھنے کے بعد ہم کتب خانہ آصفیہ میں پہنچے۔ اس کتب خانہ کے مہتمم ڈاکٹر راحت اللہ سے ملاقات ہوئی۔ آپ ایک علم دوست شخصیت ہیں۔ اور ہندوستان کے مشترکہ تمدّن کا ایک قابل تقلید نمونہ۔ آپ نے اس لائبریری کے مختلف حصّوں کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی۔ قلمی نسخوں کی اس لائبریری میں بھی کمی نہیں۔ قرآن مجید کے ایسے نادر قلمی نسخے دیکھنے میں آئے کہ اُن کی تعریف حدِ امکان سے باہر ہے۔ ایک نسخہ نہایت چھوٹے سائز پر اتنے باریک کاغذ کا تھا کہ اُسے ہاتھ لگاتے ہوئے یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں میلا نہ ہو جائے۔ تعجب ہے کہ خوش نویس نے اس ورا سے نسخے میں کلام پاک کی ساری عبارت لکھ دی۔ اکثر قلمی

نسخوں میں سونے کا کام بڑی کثرت سے کیا ہوا نظر آیا۔

آج چار بجے کالج میں والی بال کا میچ تھا۔ لیکن طلبہ اور پروفیسروں کے درمیان نہیں بلکہ طلبہ کا باہمی مقابلہ تھا۔ دونوں طرف کے طلبہ کا کھیل معیاری تھا اور اس بات سے اطمینان ہوا کہ کالج میں درس و تدریس کے ساتھ ہی ساتھ کھیل کود کو بھی پوری اہمیت دی جا رہی ہے۔

شام کو ڈاکٹر زور کی قیام گاہ پر ایک ادبی نشست منعقد ہوئی اور اس میں تقریباً تمام شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوگئی اس نشست کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کسی ایک ہی مدرسۂ فکر کے حضرات شریک نہیں ہوئے بلکہ شہر کی تقریباً تمام ادبی انجمنوں سے تعلّق رکھنے والے اصحاب نے شرکت کی۔ جہاں تک میرا خیال ہے کوئی تیس کے قریب حضرات اس میں شریک ہوئے بعض حضرات کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں وہ میں یہاں درج کرتا ہوں۔

راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی۔ جناب انیس الرحمٰن مدیر "شعیب" خواجہ حمید الدین شاہد۔ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ جناب عاقل علی خاں

جناب میر حسن۔ ڈاکٹر زور۔ مرزا ضامن علی بخاری۔ ڈاکٹر حسین ظہیر۔ جناب اشفاق حسین۔ جناب کنول پرشاد کنول۔ جناب حمایت علی شاعر۔ شری یدھ ویر ایڈیٹر ملاپ۔ محترمہ جہاں بانو۔ محترمہ مسز اختر حسین اور محترمہ رضیہ بیگم۔

یہ نشست نہایت معیاری اور شستہ تھی۔ اور حیدرآباد میں اردو کی معیاری نشست کا منعقد ہونا کوئی بڑی بات بھی نہیں۔ ہاں بڑی بات یہ تھی کہ بقولِ میزبان پولیس ایکشن کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ حیدرآباد کے اردو شعراء اور ادباء ایک مرکز پر جمع ہوئے تھے۔ اور انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

مسز اختر حسین نے اختر صاحب کی علالت کا ذکر کیا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ شاہد صاحب کے ہمراہ مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوں گا لیکن مجھے افسوس ہے کہ مصروفیات بڑھ جانے کے باعث میں ان کے دولت کدے پر حاضر نہ ہو سکا۔ اور ابھی تک خط لکھ کر ان سے معذرت بھی نہیں کر سکا۔

رات کے کھانے کی دعوت محترمہ بشیر النساء بیگم کی جانب سے

سے تھی۔ وہاں کھانے کے بعد شعروشاعری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور
بارہ بجے کے قریب ہم لوگ گھر واپس لوٹے۔

شام کی نشست کے بعد جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے اگلے دن
کا پروگرام طے ہوا۔ اور وہ پروگرام اس قدر مصروفیات سے پُر تھا کہ
شام تک تمام کاموں کا مکمل ہو جانا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔

حضرت امجد اس نشست میں تشریف نہیں لائے تھے۔ اُن کی رباعیات
میں ایک مدت سے پڑھتا چلا آرہا تھا۔ اُن سے ملاقات کی بڑی آرزو
تھی۔ اس کے علاوہ عثمان ساگر اور گولکنڈے کے مقابر دیکھنے کی بھی
بڑی تمنا تھی۔ عثمان ساگر شہر سے کوئی بارہ میل دور ہے۔ اور گولکنڈے
کے مقابر بالتفصیل دیکھنے کے لئے کم از کم ایک دن چاہیئے۔ ان مصروفیات
میں اضافہ یوں ہوا کہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نے یونیورسٹی گرلز کالج میں کلام
پڑھنے کی فرمائش کی۔ اُن کی فرمائش کو قبول نہ کرنا آسان کام نہ تھا۔ ڈیڑھ
بجے کے لئے میں عثمانیہ یونیورسٹی میں آنے کا وعدہ کر چکا تھا اور شام کے
چار بجے چادر گھاٹ کالج میں بزم اردو کا افتتاح کرنے کی فرمائش ہوئی
تھی۔ لہٰذا اس پروگرام کی تکمیل کے متعلق یوں طے پایا کہ صبح ساڑھے پانچ بجے

تیار ہو کر عثمان ساگر کا رُخ کیا جائے۔ ساڑھے سات بجے کے قریب ناشتہ وہاں کیا جائے۔ وہاں سے واپسی پر گورستان شاہی کی زیارت کریں۔ ساڑھے گیارہ بجے تک واپس آکر بارہ بجے یونیورسٹی گرلز کالج کا عزم کریں۔ وہاں سے ایک گھنٹے میں فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے تک عثمانیہ یونیورسٹی پہنچیں۔ وہاں سے تقریر، شعر و شاعری اور چائے وغیرہ کے بعد چار بجے تک چادر گھاٹ کالج میں پہنچ کر بزم اُردو کا افتتاح کیا جائے۔ وہاں سے ساڑھے پانچ یا چھ بجے تک آزاد ہو کر گھر پہنچیں اور مدراس جانے کی تیاری کریں۔ مدراس کی گاڑی آٹھ بجے روانہ ہوتی تھی لہذا پونے آٹھ بجے تک اسٹیشن پر پہنچنا لازمی تھا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پروفیسر شاہد نے یہ ذمہ داری لی کہ وہ حضرت امجد کو اپنے ہمراہ لائیں گے اور عثمان ساگر کی سیر میں وہ بھی شریک ہوں گے دوسری سب سے بڑی ذمہ داری انھوں نے یہ لی کہ مجھے صبح ساڑھے چار بجے ٹیلیفون کریں گے تاکہ میں ایک گھنٹے میں تیار ہو جاؤں۔ مجھے اتنی صبح جگانے کے لیے ٹیلیفون بہترین ذریعہ تھا۔ چنانچہ زور صاحب نے ٹیلیفون کی میز میرے پلنگ کے قریب سرکا دی۔ اب شومیٔ تقدیر دیکھیے کہ دن کے

وقت مجھے کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بخار کو روکنے کے لئے کونین کھالی۔ دن بھر چائے کے دور چلتے رہے۔ چلئے میں نے اتنی زیادہ پی لی کہ رات کو نیند آنا دشوار ہو گیا۔ صبح ساڑھے چار بجے شاہد صاحب کے ٹیلیفون کا تصور سوہان روح بنا ہوا تھا۔ میں سونے کی جس قدر کوشش کرتا تھا نیند اسی قدر آنکھوں سے دُور بھاگتی تھی۔ حتیٰ کہ ساری رات نیند کو بلانے کی کوشش میں صرف ہو گئی۔ اور میں ساڑھے چار بجے تک کروٹیں ہی بدلتا رہا۔ عین وقت پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اب اس سے مجھے کیا مسرت ہوتی ساری رات آنکھوں میں بسر کرنے کے بعد اتنا طویل پروگرام کیسے مکمل ہوگا میں اس تصور سے کانپ اُٹھا۔ جسم اس وقت عثمان ساگر کی سیر کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ اب میرے نہ جانے سے ڈاکٹر زور۔ پروفیسر شاہد۔ حضرت ضامن۔ حضرت امجد ان سب کا پروگرام خراب ہو گا میں نے انکار نہ کیا۔ اور سب سے زیادہ مجھے زور صاحب کے بچوں کا خیال تھا جو ساڑھے پانچ بجے تک بالکل تیار ہو کر شوفر کو نیند سے جگا رہے تھے۔

میں بادلِ ناخواستہ تیار ہوا۔ اور کوئی چھ بجے ہم لوگ گھر سے چلے۔ ارادہ یہ تھا کہ طلوع کا منظر وہیں دیکھیں گے۔ رستے میں طے شدہ

مقام پر ہم نے پروفیسر شاہد جناب ضامن اور حضرت امجد کا انتظار شروع کیا۔ اُن کی موٹر آئی اور ہمارے قریب پہنچی ہی تھی کہ اس کا ایک پہیہ نکل گیا اور ایک بہت بڑا حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ حضرتِ امجد نزلے اور بخار کے باوجود تشریف لائے تھے۔ میں اُن کی اس عنایت کا جس قدر بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔

اب گاڑی کی مرمّت شروع ہوئی۔ ہم بھی اُن کے ساتھ رُکنا ہی چاہتے تھے لیکن شاہد صاحب اور ضامن صاحب کے کہنے پر ہم انھیں وہیں چھوڑ کر اپنی منزل کو روانہ ہوئے۔ انھوں نے ہمیں یقین دلا دیا تھا کہ تھوڑی دیر میں گاڑی کی مرمّت ہو جائے گی اور ہم لوگ پہنچ جائیں گے۔ اگر وہ یہ یقین نہ دلاتے تو ہم اُنھیں چھوڑ کر ہرگز نہ جاتے۔ کیوں کہ ناشتے کا سارا سامان اُن کی گاڑی میں تھا اور ہماری گاڑی میں شعر و شاعری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ امجد صاحب کو ہم نے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا اور بل کھاتی ہوئی سڑک سے ہوتے ہوئے عثمان ساگر پر جا پہنچے۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ عثمان ساگر کا منظر حقیقی طور پر ایک طلسماتی منظر تھا اس کا ذکر اب یہاں لاحاصل ہے۔ کیوں کہ اس کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا

تھا وہ اپنی نظم "عثمان ساگر" میں کہہ چکا ہوں۔ یہ نظم یوں شروع ہوتی ہے

نگاہوں کا سفینہ چھوڑ کر موجوں کے دھارے پر

کھڑا ہوں دم بخود عثمان ساگر کے کنارے پر

تھوڑی دیر تک تو ہم پہاڑی پر چڑھ کر موجوں کا نظارہ کرتے رہے اس کے بعد نیچے اُترے اور پھولوں کی جلوہ گاہ کی جانب جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ درماندہ رفیقوں کی گاڑی آ پہنچی۔ اب قافلہ پل سے ہو کر پانی کے کنارے پتھروں پر فروکش ہوا۔ پروفیسر شاہد اور حضرت ضامن (اس وقت میزبان یہی حضرات تھے) تو ناشتے کو مکمل کرنے کے لئے ملازموں کا ہاتھ بٹانے لگے۔ بچے کھیل کود میں مصروف ہو گئے۔ اور ڈاکٹر زور حضرت امجد اور راقم باتوں میں لگ گئے۔ ڈاکٹر زور نے مجھ سے فرمائش کی کہ وہ جو کل کی نشست میں تم نے غزل پڑھی تھی

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری

وہ سناؤ۔ اس وقت میرے جسم کا ایک ایک عضو نیند کے مارے درد کر رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اس وقت شعر و شاعری کا سلسلہ نہ چلے بلکہ یوں ہی باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن ڈاکٹر زور نے اس غزل کے دو ایک شعر جو پڑھے تو انھوں نے

"دیوانہ را ہوئے بس است" کا کام کیا اور میں نے غزل شروع کی۔ آب رواں کے کنارے اس غزل نے خود مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دی اور میری جسمانی تکان آہستہ آہستہ رفع ہونے لگی جب میں غزل پڑھ چکا تو قریب قریب تازہ دم ہو چکا تھا۔ اب میں نے حضرت امجد سے گزارش کی کہ وہ کچھ رباعیات عنایت فرمائیں۔ انھوں نے ابتدا اس رباعی سے کی ؎

آنکھوں سے چھپے نگاہ سبحان اللہ

دل سے مخفی ہو آہ سبحان اللہ

پردہ کیا اس نے مجھ سے مجھ میں چھپ کر

کیا آڑ بنائی واہ سبحان اللہ

اتنی اچھی رباعی مدت کے بعد سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ چنانچہ جب انھوں نے دوسری رباعی شروع کی تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا ذرا رک جائیے۔ ابھی میں اسی رباعی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ پھر میں نے یہ رباعی دُہرائی۔ حضرت امجد بڑے تعجب سے کہنے لگے کہ تم نے ایک بار سُن کر یاد کر لی۔ میں نے کہا اچھے شعر کی یہی تو خوبی ہے اس

رباعی کے بعد آپ نے چند اور رباعیاں سنائیں جنھیں میں یہاں درج کرتا ہوں ؎

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے
مضمونِ بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر بہ اعتبارِ فن خوب کہا
ہر شعر میں تاثیر کہاں سے لائے

عارض ہو کہ خدّ و خال میرا کیا ہے
نقصان ہو یا زوال میرا کیا ہے
مانا کہ میرا خیال ہی ہے سب کچھ
لیکن میرا خیال میرا کیا ہے

دُنیا میں یہ بد نصیب جیتے کیوں ہیں
افلاس کے یہ نقیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا
معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں

سر چڑھ کے زمیں میں اترتے کیوں ہیں

رکھ کر بھی تمام زندگی کے ساماں

معلوم نہیں امیر مرتے کیوں ہیں

مندرجہ ذیل رباعی کے متعلق آپ نے کہا کہ یہ میں نے ڈاکٹر اقبال کو بھیجی تھی۔ انھوں نے جواب میں لکھا تھا کہ آپ کی رباعی سے میں مسلسل تین دن تک مسحور ہوتا رہا ہوں اور وہ رباعی یہ ہے۔

ہیں مست مئے شہود تو بھی میں بھی

ہیں مدعیٔ نمود تو بھی میں بھی

یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں

ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

حیدرآباد کے کسی رئیس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک بار اس نے کھانے پر بلایا اور کھانے کے دوران میں مختلف طریقوں سے اظہارِ تموّل کرتا رہا میں نے یہ رباعی اُس وقت اُسے سُنائی۔

ڈیوڑھی نہیں در نہیں کہ دربان نہیں

بُلبُل نہیں گُل نہیں کہ بستان نہیں

ہے جمع جہان بھر کا ساماں گھر میں

خاطر جمعی کا کوئی سامان نہیں

اس رباعی کے سنتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور وہ کہنے لگا کہ آپ نے واقعی اس رباعی میں میری تصویر پیش کی ہے۔ میری دلی کیفیت ایسی ہی ہے اور مجھے بالکل خاطر جمعی میسّر نہیں۔

اس اثناء میں ناشتہ تیار ہو چکا تھا۔ اب شعر و شاعری کو چھوڑ کر ہم کھانے کی جانب متوجہ ہوئے۔ باتوں کا سلسلہ ناشتے کے دوران میں جاری رہا۔ اور ہم لوگ جیسا کہ عام طور پر دعوتوں میں ہوتا ہے بہت زیادہ کھا گئے امجد صاحب نے اس موقع پر کہا ؎

چُبھتا ہے ہر ایک کی نظر میں

اچھا کپڑا بھی کیا بُرا ہے

کھا جاتے ہیں پیٹ سے زیادہ

اچھا کھانا بھی کیا بُرا ہے

ناشتے سے فارغ ہوئے تو نو بج چکے تھے۔ اب واپسی کی تیاری شروع کی۔ کوئی سوا نو بجے ہماری موٹریں گولکنڈے کو جا رہی تھیں۔

گولکنڈہ —— یہ کسی شہر کا نام نہیں۔ یہ کوئی مقام نہیں بلکہ روئے زمین پر بکھری ہوئی داستانِ عبرت کا نام ہے۔ گولکنڈہ محض کھنڈروں کی دُنیا نہیں بلکہ تاریخِ ہند کا ایک ایسا باب ہے جسے ہر دور کے سیّاح، مورّخ شاعر، ادیب اور فن کار پڑھتے جائیں گے اور اس پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کرتے جائیں گے۔

اس سرزمین پر قطب شاہی خاندان کوئی دو سو برس تک (۱۵۱۸ء سے ۱۶۸۷ء تک) حکم راں رہا۔ اور یہ زمانہ دکن تو کیا سارے ہندوستان کی تاریخ میں ایک زرّیں عہد کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ اس خاندان کے عہد میں ہندوستان میں مشترکہ تمدّن کی بنیادیں اور زیادہ مضبوط ہوئیں اور اس کی بدولت اردو نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی۔ اس دور میں اردو کی ایسی بلند پایہ کتب لکھی گئیں جو ہماری تاریخ ادب میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

یہ وہی سرزمین ہے جس کے متعلّق اقبال نے کہا

۵ ـــ

آہ جولاں گاہ عالمگیر یعنی وہ حصار

دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار

زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے

یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے

کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا

دیدۂ عبرت! خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے

آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر

جنبشِ مژگاں سے ہے چشمِ تماشا کو حذر

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں

جو اُتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی ہے جن کو آرزوئے ناصبور

قبر کی ظلمت میں ہے اُن آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک

کیا یہی ہے اُن شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

اشک باری بہانے ہیں یہ اُجڑے بام و در
گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشم تر

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ اُمّت بھولنے والی نہیں

تو اس عبرت آباد میں ہم کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک پھرتے پھراتے رہے پروفیسر زور ہر گنبد اور مقبرے کے متعلق بڑی تفصیل سے واقفیت بہم پہنچاتے رہے میں تو انھیں فقط ایک ادیب سمجھتا تھا لیکن آپ میدانِ تاریخ کے بھی مرد نکلے۔ یہاں سے ناقابلِ بیان تاثرات لئے ہم گھر کو روانہ ہوئے۔ گولکنڈہ کے مقابر کوئی ایسی چیزیں نہیں تھیں کہ میں انھیں دیکھتا اور اُن کا میرے

دل پر اثر نہ ہوتا۔ اگرچہ اس عوامی دور میں حکومت کے متعلق نظریات بدل چکے ہیں لیکن ایک ہی مقام پر اس تعداد میں تاجداروں کی قبروں کو دیکھنا اور اُن سے متاثر ہوئے بغیر آنا میرے لئے ناممکن تھا۔ یہ موضوع بھی بار بار مصرعوں میں ڈھل کر میرے ذہن میں آیا لیکن ہر بار اقبال کی "گورستانِ شاہی" ایک رکاوٹ بن کر سامنے آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس موضوع پر کہی ہوئی پندرہ بیس اشعار کی نامکمل نظم کو میں نے یہ کہہ کر ختم کیا کہ یہ موضوع اقبال کا حصہ ہو چکا ہے اور اب اس پر کچھ کہنا میرے بس کی بات نہیں۔

گھر پہنچے تو سوا بارہ بج چکے تھے اور بارہ بجے ہمیں یونیورسٹی گرلز کالج میں پہنچنا تھا۔ فوراً شاہد صاحب کو ساتھ لیا اور کوئی ساڑھے بارہ تک کالج جا پہنچے۔ وہاں محترمہ جہاں بانو صاحبہ، اسٹاف کی دیگر ممبر اور طالبات منتظر تھیں۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ طالبات کے دل میں اردو کے لئے اس قدر ذوق و شوق دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی۔ جہاں بانو صاحبہ نے پرنسپل صاحبہ سے تعارف کرایا۔ اور پرنسپل صاحبہ نے طالبات سے۔ پرنسپل ایک انگریز خاتون ہیں۔ رسمیات ختم ہوئیں تو پروگرام شروع ہوا۔ میں نے ایک غزل پڑھی اس کے بعد ایک لڑکی نے فرمائش کی کہ کل ایٹ ہوم میں جو غزل پڑھی

تھی وہ سنائیے۔ ایٹ ہوم میں میں نے کئی غزلیں پڑھی تھیں لہٰذا پوچھنا پڑا کہ کون سی تو جواب ملا "دیوانوں پہ کیا گزری"۔ چنانچہ میں نے یہ غزل پڑھی اور جب پڑھ چکا تو بعض طالبات نے اُردو اور اس کے مستقبل کے متعلق کچھ سوالات دریافت کیے۔ سوال جواب کا سلسلہ ختم ہوا تو پھر غزل کی فرمائش ہوئی۔ میں نے تعمیل کی۔ اب ایک بجنے کو تھا اور ایک بجے مجھے عثمانیہ یونیورسٹی میں پہنچنا تھا۔ میں نے اجازت طلب کی لیکن پولیس ایکشن کے بعد طالبات کو پہلی بار اس طرح شعر سُننے کا موقع ملا تھا۔ انھوں نے کہا کہ جانے سے پہلے ایک غزل اور سنا کر جائیے۔ اب کے میں نے ایک غزل کے دو چار شعر سنائے۔ اور پرنسپل صاحبہ نے اختتامی تقریر کی جلسہ ختم ہوا اور میں اپنی کتابیں سنبھال ہی رہا تھا کہ کوئی سو کے قریب لڑکیوں نے گھیر لیا۔ یہ ہجوم آٹوگراف لینے کے لئے جمع ہوا تھا۔ میں نے بہت کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں میرا انتظار ہو رہا ہے۔ آپ اس وقت آٹوگراف کا سلسلہ رہنے دیں لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی اور کہا کہ آٹوگراف لیے بغیر ہم آپ کو نہ جانے دیں گی۔ وقت کی کمی کے باعث اُن کی فرمائش کی تعمیل ممکن نہ تھی۔ اس موقع پر شاہد صاحب کی منت سماجت

بھی کسی کام نہ آئی اور مجھے آٹوگراف کے لیئے رُکنا ہی پڑا۔ کوئی بیس
چالیس کتابوں پر ایک ایک شعر لکھنے کے بعد ہاتھ تھک گیا تو صرف دستخط
کرنا شروع کیئے۔ لیکن لڑکیاں مُصر تھیں کہ دستخط کے ساتھ شعر کا ہونا
بہت ضروری ہے۔ آخر اُن سے میں نے یہ وعدہ کیا کہ اس وقت آپ
مجھے یونیورسٹی جانے دیں۔ مدراس جاکر میں چالیس پچاس مختلف
کاغذات پر دستخط سمیت اشعار لکھ کر آپ کو بھیج دوں گا۔ انھوں نے
میری بات مان لی اور مجھے اجازت دے دی۔ افسوس ہے کہ میں
اپنا یہ وعدہ ابھی تک پورا نہیں کر سکا۔ اب جب کبھی حیدرآباد جاؤں گا
تو ان سب سے اس کوتاہی کے لیئے معافی مانگوں گا۔

ادھر سروری صاحب پریشان تھے۔ ڈیڑھ بج چکا تھا اور
میرا کوئی پتہ نہ تھا۔ اُنھوں نے دو ایک جگہ پر ٹیلیفون بھی کیا لیکن
کچھ پتہ نہ چلا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ میں کہاں رُک گیا ہوں۔ جب
میں یونیورسٹی پہنچا تو بزمِ اردو کے اکثر ممبر باہر دروازے پر منتظر
تھے۔ میں کوئی چالیس منٹ دیر سے پہنچا تھا۔ لیکن جلسہ گاہ میں حاضرین
اسی طرح جمے بیٹھے تھے۔ انھیں غالباً اس امر کا احساس تھا کہ آزاد سفر

ہیں ہے اور سفر میں وقت کی پابندی برقرار رکھنے میں کسی حد تک بے قاعدگی ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے جاکر معذرت طلب کی اور دیر سے آنے کی تلافی یوں کی کہ تقریر کو سمیٹ کر پندرہ بیس منٹ کے گھیرے میں لے آیا۔ تقریر کے دوران میں اردو کے متعلق کچھ سوال بھی ہوئے اُن کا جواب دینے کے بعد میں نے کوئی چار نظمیں اور غزلیں پڑھیں۔ میں اپنا کلام پڑھ ہی رہا تھا کہ گرلز کالج کی بعض طالبات جلسے میں شریک ہونے کے لئے آپہنچیں۔ حیدرآباد کے نئے ماحول میں اردو کی یہ ہردل عزیزی میرے لئے بہت حوصلہ افزا تھی۔ شعروشاعری کا سلسلہ ختم ہوا تو آٹوگراف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں بعض طلبہ کو آٹوگراف دینے کے بعد جب میں نے کہا کہ اب میں تھک گیا ہوں تو اکثر نے میری بات مان لی اور چلے گئے۔ ہاں بعض طلبہ پروفیسر سروری کے کمرے تک میرے ساتھ رہے اور مجھے اُن کے سامنے ہار ماننا پڑی۔ اب تین بج چکے تھے۔ چنانچہ یہاں چائے پینے کے بعد میں چادر گھاٹ آرٹس کالج کو روانہ ہوا۔ وہاں معلوم ہوا کہ جارج برنارڈشا کے انتقال کر جانے کی وجہ سے کالج میں چھٹی ہو چکی ہے۔ اس وقت جسمانی طور پر

مجھ میں مزید جلسوں میں شریک ہونے کی ہمت نہ تھی۔ اور اگر کسی اور وجہ سے کالج میں چھٹی ہوتی تو مجھے اطمینان سا ہوتا لیکن برنارڈ شا ایسے ادیب اور تمثیل نگار کے دنیا سے اٹھ جانے سے بہت صدمہ ہوا اگرچہ شا اپنی عمر طبیعی تک پہنچ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود اس کوہ وقار فن کار کی موت کی خبر سن کر بے حد رنج ہوا۔ انگریزی تمثیل میں شا کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اب شاید ہی پُر ہو سکے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کالج میں پروفیسر زور میرے منتظر تھے۔ وہاں سے ہم گھر آئے اور دو ایک گھنٹے میں تیار ہو کر پونے آٹھ بجے کے قریب اسٹیشن پہ پہنچ گئے کیونکہ مدراس کو گاڑی آٹھ بجے روانہ ہوتی تھی۔

حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے زمانے کی داستانیں مختلف جگہوں پر سنیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن ایک بات جو ہر زبان پر تھی اور جس کا کبھی کبھار دلی میں بھی ذکر سننے میں آجاتا تھا یہ تھی کہ حیدرآباد

ہیں پولیس ایکشن ہز اگزالٹڈ ہائی نس نظام اور حکومت حیدرآباد کے کہنے
سے ہوا۔ ثبوت اس کا مقامی لوگ یہ پیش کرتے تھے کہ حیدرآباد کی
فوج نے کسی مقام پر بھی تو ہندوستانی فوج یا پولیس کا مقابلہ نہیں
کیا۔ ہاں ریاست کے کمانڈر انچیف جنرل العدروس کی یہ کوشش رہی
کہ ہندوستان کے تینوں کمانڈروں میں میجر جنرل چودھری ہی
سب سے پہلے حیدرآباد میں پہنچیں کیوں کہ میجر جنرل چودھری حیدرآباد
میں رہ چکے تھے۔ اور انھیں حیدرآباد کے اندرونی حالات سے کماحقہ
واقفیت تھی اس کے علاوہ میجر جنرل چودھری نے حیدرآباد میں جنرل
العدروس ہی سے فوجی تربیت حاصل کی تھی اور دونوں سپاہیوں میں
استاد شاگرد کا رشتہ تھا۔

جنرل العدروس نے میجر جنرل چودھری کی رفتار کو باقی کمانڈروں
کے مقابلے میں تیز تر کرنے کے لئے باقی دونوں اطراف میں رضاکاروں
کے ذریعے سے دریاؤں کے بند تڑوا دیئے تھے۔ جس سے مشرق اور جنوب
سے آنے والی ہندوستانی افواج کی پیش قدمی، میجر جنرل چودھری
کی فوج کی بہ نسبت کسی قدر مدھم پڑ گئی تھی۔

ان داستانوں کے علاوہ حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے زمانے کے اور کوئی اثرات نظر نہ آتے تھے۔ ریاست میں ہندو اور مسلمان شیر و شکر ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں اور ریاست کی قدیمی روایات کو ایک مقدس امانت سمجھ کر سنبھالے ہوئے ہیں۔ تاریخِ حیدرآباد میں سے اگر رضاکار تحریک کے دو تین برس خارج کر دیئے جائیں تو باہمی میل جول کے اعتبار سے یہ تاریخ اتنی روشن اور بے داغ ہے کہ ہندوستان کی اکثر ریاستوں کے لئے نمونہ قرار دی جا سکتی ہے۔

پولیس ایکشن کی داستانوں کے علاوہ ایک اور تذکرہ بھی حیدرآباد میں ہر کہ ومہ کی زبان پر تھا۔ اور وہ تھا ریاست کے بارہ سزا یافتہ کسانوں کا معاملہ۔ ہر شخص کی تمنا یہ نظر آتی تھی کہ ہز اگزالٹڈ ہائی نس حکومت کے اس فیصلے پر نظر ثانی کریں اور اگر معاملہ حکومت ہند کے ہاتھوں میں ہو تو پریزیڈنٹ اس فیصلے پر دوبارہ غور کریں۔

میری کوشش یہ رہی کہ ان بارہ قیدیوں کے جنھیں موت کی سزا کا حکم مل چکا ہے حالات تفصیل سے حاصل کروں۔ چنانچہ اِدھر اُدھر سے دریافت کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے سوا اور کچھ نہ معلوم

ہو سکا کہ جب رضاکا تحریک نے ریاست میں زور پکڑا اور حضور نظام اور اُن کی حکومت نے اس کو روکنے کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا تو ان لوگوں نے اس تحریک کا مقابلہ کیا اور ریاست کی امن پرور روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ یہ جذبہ لوگوں میں عام نظر آتا تھا کہ جیسے بھی ہو خواجہ احمد عباس۔ ڈاکٹر ملک راج آنند اور مسٹر آر۔ کے کرانجیہ پر مشتمل ڈیفینس کمیٹی کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں، تاکہ ان گرفتار شدہ اشخاص کی رہائی کی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔

ہاں تو میں ۲ر نومبر کو حیدرآباد سے روانہ ہوا۔ گاڑی چلی تو مجھے نیند آگئی اور بیزواڑہ پہنچنے سے پہلے آنکھ نہ کھل سکی۔ بیزواڑہ گاڑی نو بجے پہنچی۔ یہاں آکر محسوس ہوا کہ میں جنوبی ہند کی حدود میں داخل ہو چکا ہوں اسٹیشن پر چائے کی جگہ کافی بک رہی تھی۔ ناشتہ منگوایا تو اس میں کوکراوٹس کا پورج موجود پایا۔ ہر شخص تامل میں بات چیت کر رہا تھا۔ میں گاڑی سے اُترا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ یہاں کے لوگ اردو بھی سمجھتے ہیں یا نہیں۔ ایک اخبار والے سے پوچھا کہ تمہارے پاس کون کون سے اخبار ہیں۔ اس نے تامل۔ تلیگو اور انگریزی کے مختلف اخبارات کے نام گن

سُنئے۔ میں نے مدراس میل لے لیا۔ اسٹیشن کے ایک ملازم سے پوچھا کہ مدراس گاڑی کس وقت پہنچے گی۔ اُس نے کہا کہ شام کے آٹھ بجے۔ اسی طرح دو ایک اور اشخاص سے بات چیت کی اور یہ دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوا کہ اُردو میں لوگ بڑی بے تکلفی سے بات چیت کر لیتے ہیں یہاں اسٹیشن پر اُردو کے متعدد رسائل بھی بک رہے تھے۔ افسوس ہے کہ ان حقائق کے باوجود ہندوستان کے اکثر لوگ اُردو کو ہندوستان کی بھاشا نہیں سمجھتے۔

بیزواڑہ سے مدراس تک کا سفر ذہنی طور پر کافی تکلیف دہ اور وقت آمیز ثابت ہوا۔ ڈبّے میں ہم تین آدمی تھے۔ ایک میں۔ ایک کوئی عمامہ و جُبّہ پوش بزرگ اور ایک ان کا کوئی عزیز جو ملازم زیادہ تھا اور عزیز کم۔ باقی تینوں مسافر بیزواڑہ اُتر گئے تھے۔ یہ بزرگ دل کی بیماری میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹر اُن کے ہمراہ تھا۔ انھیں کوئی جلد کی بیماری بھی تھی چنانچہ ان کے جسم کو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد صاف کیا جاتا تھا۔ خیر یہ بات تو دقت آمیز نہیں تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ یہ صاحب بولتے بہت زیادہ تھے۔ اور میرے لئے لکھنا پڑھنا یا سوچنا قریب قریب

دشوار ہو گیا تھا نہ جانے "عثمان ساگر" "گولکنڈے کے مقبروں میں" اور چند رباعیات میں نے اس سفر کے دوران میں کیوں کر کہہ لیں۔ ان حضرت نے اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا کہ ایک رفیقِ سفر ہمراہ ہے وہ لکھنے پڑھنے میں مصروف ہے اس کا کچھ لحاظ کیا جائے۔ انھوں نے مجھے تو خیر پریشان کیا ہی اپنے عزیز اور ڈاکٹر کو بھی کچھ کم زچ نہیں کیا۔ غالباً یہ کوئی بہت امیر آدمی تھے۔ اور ان کے تمام اعزہ (جو ساتھ کے ڈبے میں تھے) اور معالج کو ان کی خاطرداری کا بڑا لحاظ تھا۔

مدراس جاتے ہوئے رستے میں میلوں تک پھیلی ہوئی زمینیں نظر آئیں جن پر کھیتی باڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں حیران تھا کہ حکومت کی "زیادہ اناج اُگاؤ" کی اسکیم کو عملی جامہ کیوں نہیں پہنایا جا رہا۔ کیا یہ اسکیم فقط دفتر کی فائلوں تک ہی محدود رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے لیکن مدراس جا کر زمینوں کے اس طرح بے مصرف پڑے رہنے کی وجہ معلوم ہوئی۔ وہاں کے دوستوں سے بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ بندشِ شراب کے فیصلے پر عمل درآمد کرنے سے احاطۂ مدراس کو ریونیو میں سترہ کروڑ روپے کا خسارہ ہوا ہے اس کے علاوہ قریباً چار کروڑ روپیہ اس اسٹاف پر خرچ ہو رہا ہے جو بندشِ شراب

کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مقرر کیا گیا ہے اب ایک کروڑ روپئے کے خسارے کے بعد حکومت میں یہ دم نہیں رہا کہ صوبے میں آب پاشی کے کام کی جانب توجہ دے سکے۔ اور جب تک آب پاشی سائنٹیفک لائنوں پر نہ کی جائے زراعت قریب قریب ناممکن ہے۔

یہاں تاڑی کے درخت قدم قدم پر نظر آئے۔ اور مجھے بتایا گیا کہ ان اشجار سے شراب کی ناجائز کشید زوروں پر ہے۔ اس ناجائز کشید سے ایک تو حکومت کو کروڑوں روپئے کا نقصان ہو رہا ہے دوسرے لوگوں میں چوری کی عادت زور پکڑ رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ گھریلو شراب جو شمشیر براں سے کم نہیں پینے والوں کی صحت کو تباہ کر رہی ہے۔

تاڑی کے اشجار کی تصاویر میں نے اکثر دیکھی تھیں اور مجھے یہ کبھی پسند نہیں آئی تھیں لیکن اب ان اشجار کو اپنے صحیح روپ میں میدانوں میں دیکھا تو ان میں ایک عجیب کیفیت نظر آئی۔

ان مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہوا میں شام کے آٹھ بجے مدراس جا پہنچا۔ سید حامد اشرف کو میں نے حیدرآباد سے اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اُن کے ہمراہ گورنمنٹ آرٹس کالج کے چند اور طلبہ اسٹیشن پر موجود

تھے۔ اسٹیشن سے ہم لوگ سید عبدالوہاب بخاری کے مکان پر پہنچے۔ میرے قیام کا انتظام یہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ آج کی دعوت ڈاکٹر مولنا عبدالحق پرنسپل پریزیڈنسی کالج مدراس کی طرف سے ہے اور وہ اپنے دولت کدے پر منتظر ہیں۔ سامان وغیرہ وہاں اُتارا گیا۔ اور اشرف صاحب اور میں اُسی گاڑی میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ سفر کی کیفیت دریافت کی۔ والد کا مزاج پوچھا اور بہت دیر تک والد، ڈاکٹر اقبال، شیخ سر عبدالقادر اور "مخزن" کے دورِ اول کا ذکر کرتے رہے۔ وہاں اور لوگ بھی کھانے پر مدعو تھے۔ جن میں سے پروفیسر آغا حیدر اشرف دہلوی اور پروفیسر ایم۔ اے ندوی کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر جائے قیام پر آئے۔ پروفیسر بخاری "خانہ بہ مہماں گزاشت" کے مصداق میرے پہنچنے سے ایک دن پہلے کسی ضروری کام سے حیدرآباد چلے گئے تھے۔ اُن کے فرزند موجود تھے۔ آپ پریزیڈنسی کالج میں طالب علم ہیں اور امتحان کی تیاری کے باوجود آپ نے توجہ اور مہماں نوازی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

ہیں سفر کا تھکا ہوا تو تھا ہی. آتے ہی سو گیا۔ صبح چھ بجے آنکھ کھلی اور نہا دھو کر آٹھ بجے تک تیار ہو گیا۔ یہاں میرے آنے سے پہلے اشرف صاحب کے پاس خطوط جمع ہو چکے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں ان کا جواب دینے بیٹھ گیا۔ ناشتے کے وقت ایک نئی شخصیت سے ملاقات ہوئی. یہ تھے پروفیسر محمد حسین. آپ یونیورسٹی آف ٹراونکور میں اسلامک ہسٹری کے پروفیسر ہیں۔ ان کی داڑھی دیکھی تو سمجھا کوئی زاہد خشک ہوں گے اور ہر وقت مذہب کی باتیں کر کے پریشان کریں گے لیکن تھوڑی ہی دیر میں یہ اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ آپ تو دریائے لطافت نکلے. بات میں بات پیدا کرتے تھے۔ اور جتنے دن میں مدراس میں رہا آپ کی بدولت وقت بہت اچھی طرح سے بسر ہوا۔

کوئی بارہ بجے اشرف صاحب اس نیت سے آئے کہ قابلِ دید مقامات کی سیر کریں گے لیکن میں نے یہ کہہ کر انہیں رخصت کر دیا کہ آج رات کو مشاعرہ ہے آپ انتظامات وغیرہ میں مصروف ہوں گے لہٰذا آج آپ کالج ہی میں رہیے۔ سیر وغیرہ کا پروگرام مشاعرہ کے بعد طے کریں گے دن بھر اردو ایسوسی ایشن کے اراکین تشریف لاتے رہے کوئی ڈیڑھ بجے کے

قریب "ڈیلی ایکسپریس" کے مقامی نمائندہ جناب عدنی تشریف لائے۔ اُن سے آدھ گھنٹے تک بات چیت کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ اردو سے بالکل ناواقف ہیں چنانچہ بڑا تعجب ہوا کہ جب اردو بالکل نہیں جانتے تو مجھ سے ملنے کیوں آئے ہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا اُن سے پوچھ ہی لیا کہ آپ اردو بھی کچھ جانتے ہیں تو معلوم ہوا کہ آپ کو اردو سے خاصی دلچسپی ہے بالخصوص اُردو جرنلزم سے۔ اب یہ جاننے کے بعد انگریزی میں بات چیت محض تکلف تھا۔ لہذا اردو میں گفتگو شروع ہوئی۔ آپ شمالی ہند اور پاکستان میں اُردو جرنلزم کے متعلق سوالات پوچھتے رہے۔ پاکستان کے متعلق تو میری واقفیت کم تھی (انقلابات ہیں زمانے کے) شمالی ہند کے متعلق جب میں نے انھیں بتایا کہ یہاں اُردو کے اخبارات کی اشاعت پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار ہے اور دہلی میں دو ماہنامے ایسے ہیں "شمع" اور "بیسویں صدی" جو ساٹھ اور تیس ہزار چھپتے ہیں تو آپ کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ آپ نے شام کو سدرن انڈیا جرنلسٹس فیڈریشن کے دفتر میں آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ شام کو وہ آئے اور مجھے اپنے ہمراہ لے گئے۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہم ساحلِ بحر کی سیر کو نکلے۔ دامنِ ساحل میں موجوں کا رقص

ایک عجیب سماں پیدا کر رہا تھا۔ بعض مقامات پر تو لہریں اتنے زور سے اور اس قدر بلند اُٹھ رہی تھیں کہ اس طوفانی کیفیت کو دیکھ کر خوف آتا تھا یہ رباعی وہیں موزوں ہوئی ؎

یہ بحر ہیں طوفاں کا نظارا اے دل!

کیا بات ہے کیوں نہیں گوارا اے دل!

تو ذوقِ نگاہ سے ہے عاری ورنہ

ہر موج ہے تیرا کنارا اے دل!

رات ہوئی تو ہم گھر واپس لوٹے۔ دوپہر کو بنگلور سے دو شعراء تشریف لا چکے تھے۔ ایک جناب محمد اسمٰعیل تابش مدیر روزنامہ "پاسبان" اور دوسرے لالہ خوب چند۔ ملاقات ان سے یہاں ہوئی۔ کلام ان کا مشاعرے میں سُنا۔

رات کے کھانے میں مہمانوں کی کمی نہ تھی۔ صرف میزبان غائب تھے۔ کھانے کے بعد ہم لوگ اشرف صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ کیونکہ انھیں آکر ہمیں مشاعرہ میں لے جانا تھا۔ نو بجے کے قریب اردو ایسوسی ایشن کے دو تین اراکین کے ہمراہ اشرف صاحب آئے اور ہمیں مشاعرہ گاہ میں

لے گئے ۔

گورنمنٹ آرٹس کالج کا ہال دوسری منزل پر ہے اور اسی میں مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا۔ ہم پہنچے تو ڈاکٹر عبدالحق۔ پروفیسر زیدی اور دیگر حضرات ہال کے دروازے پر موجود تھے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے اسٹاف رُوم میں بیٹھے۔ اتنے میں وزیر تعلیم شری مادھو امینن تشریف لائے۔ ان سے ملاقات ہوئی اور ہم ہال میں پہنچے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اوپر سامنے کا ڈائس خواتین کے لئے وقف تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ معززین شہر مشاعرہ گاہ میں بڑی بھاری تعداد میں موجود ہیں۔ ہال بھر جانے کی وجہ سے دروازوں اور برآمدوں میں بھی شائقین جوق در جوق موجود تھے۔ مشاعرے کا افتتاح شری مادھو امینن نے کیا۔ آپ نے کہا:۔

"شعر و نغمہ نے بنی نوع انسان کی تربیت نفس میں جو کام کیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور مشاعرہ شعر و نغمہ کا ایک ایسا مظاہرہ ہے جس کی پشت پر سالہا سال کی روایات چلی آتی ہیں۔ مشاعرے کے انعقاد سے صرف شعرا کی عزت افزائی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس سے فنِ شعر کے ارتقاء کا مقصد

بھی حل ہوتا ہے۔

مشاعرہ ویسے بھی ہمارے تمدن کا ایک خوبصورت جزو ہے اور آج کا مشاعرہ تو اس لئے بھی خاص طور پر اہم ہے کہ اس کے ساتھ ایک نہایت مفید مقصد وابستہ کر دیا گیا ہے اور وہ مقصد ہے کالج کے غریب طلبہ کی امداد"

اس افتتاحی تقریر کے بعد جناب فضل اللہ ایکٹنگ پرنسپل نے شعراء کو خوش آمدید کہا۔ اور قریباً دس بجے مولنا عبدالحق کی زیر صدارت مشاعرہ شروع ہوا۔ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو شاعری کی ہر دور کی تدریجی ترقیوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا۔ مشاعرے اور اُن کی افادیت پر ایک نظر ڈالی اور مشاعرے کی کارروائی شروع کی۔ ابتدا تلاوتِ کلام پاک سے ہوئی۔ اس کے بعد سید حامد اشرف نے شری سی راج گوپال آچاریہ (ایک بیئر محکمہ مرکزی حکومت)، شری پی۔ ایس کمار سوامی راجا چیف منسٹر مدراس شری کے سوامی ناتھن پرنسپل گورنمنٹ آرٹس کالج اور مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے پیغامات پڑھ کر سنائے۔ شری سی راج گوپال آچاریہ نے اس موقع کے لئے ایک خاص نظم موزوں کی تھی جس

کا ترجمہ اُردو نظم میں پروفیسر رحیم احمد فاروقی نے کیا اور مشاعرہ میں سُنایا
اس نظم کا ایک بند اس وقت تک میرے ذہن میں محفوظ ہے اور اگر میں
اس کا نثر میں ترجمہ کروں تو یوں کروں گا۔

بادشاہ نے اپنے لئے ایک مقبرہ بنوایا
تاکہ موت کے بعد اس میں ابدی نیند سو سکے
اور وہ مقبرہ ہے حسین تاج
اور جو شخص اپنے بھائی سے نفرت کرتا ہے
اپنی زندگی ہی میں اپنے لئے جہنم تیار کرتا ہے
اور وہ جہنم بدنمائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی
جیسے تاج حسن و نفاست میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

مشاعرے کا تفصیلی ذکر لاحاصل ہے۔ صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے
کہ یہ مشاعرہ شمالی ہند کے اچھے اور کامیاب مشاعروں سے کسی حیثیت میں
کم نہیں تھا۔ صدر کے شگفتہ فقرے مشاعرے میں جان ڈال رہے تھے۔
آپ کا سنجیدہ اور کبھی کبھی مزاحیہ انداز بیان مشاعرے میں ایک خاص
کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ شعرا باری باری اپنا کلام سنا رہے تھے۔

حاظرین موقع اور محل کے مطابق داد دے رہے تھے۔ اخبارات کے رپورٹر رپورٹیں لینے میں محو تھے اور فوٹو گرافر تصاویر لینے میں۔ یہ پُرلطف محفل صبح کے ڈیڑھ بجے تک جاری رہی اور اس کی کامیابی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب تک صدر نے مشاعرے کو ختم کر دینے کا اعلان نہ کیا حاضرین اپنی اپنی جگہ پر جمے رہے اور کوئی شخص مشاعرہ کو چھوڑ کر نہ گیا۔ منتظمین اس کامیابی پر پھولے نہ سماتے تھے اور ان کی یہ مسرت اور خوشی بالکل مناسب اور موزوں تھی۔ مدراس میں اس قدر کامیاب مشاعرہ منعقد کرنا کوئی معمولی کامیابی نہ تھی۔ مشاعرے کے بعد یہاں بھی آٹو گراف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہال سے نکلتے نکلتے دو سوا دو بج گئے۔ کوئی تین بجے تک ہم ایسوسی ایشن کے اراکین کے ہمراہ اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔ وہاں اپنے اپنے رنگ میں سب نے مشاعرے پر تبصرہ شروع کیا۔ کوئی پانچ بجے یہ سلسلہ ختم ہوا اور ہمیں سونا نصیب ہوا۔

اگلے دن اتوار تھا۔ کچھ اس خیال سے اور کچھ رات کو جاگنے کے باعث دیر سے بیدار ہوا۔ گیارہ بجے کے قریب جیمنی پکچرز کے گیت نگار

شری منجیت سنگھ رانا جو اُردو کے اچھے شاعر ہیں۔ پنجاب ایسوسی ایشن کی طرف سے دعوت لے کر پہنچے۔ ایسوسی ایشن نے شام کو کلب میں بلایا تھا۔ شری منجیت وقتِ مقررہ سے کچھ دیر پہلے آئے اور مجھے کلب میں لے گئے۔ وہاں ایسوسی ایشن کے ممبروں سے ملاقات ہوئی اور مجھے یہ دیکھ کر مسرّت ہوئی کہ پنجاب ایسوسی ایشن کے ممبر صرف پنجابی ہی نہیں، بلکہ غیر پنجابی بھی ہیں۔ موجودہ دور میں ایسی ہی انجمنوں کی ضرورت ہے جو صوبائی ملکی اور مذہبی تعصب کی حد بندیوں کو توڑ کر بنی نوعِ انسان کو ایک ہی مرکز پر لائیں اور میں نے دیکھا کہ پنجاب ایسوسی ایشن یہ فرض بخوبی انجام دے رہی ہے یہاں میں نے اراکین کی فرمائش پر متعدد نظمیں اور غزلیں سنائیں اور کوئی ایک گھنٹے کے بعد یہ نشست برخاست ہوئی۔ پنجاب ایسوسی ایشن کے ممبروں کی محبت اور ان کا حسن سلوک میری زندگی میں ہمیشہ ایک یادگار کی طرح رہے گا۔

وہاں سے فارغ ہو کر قیام گاہ پر پہنچے۔ حضرت تابش اور لالہ خوب چند بنگلور واپس جا رہے تھے۔ انھیں الوداع کہنا ضروری تھا۔ ان حضرات سے بنگلور آنے کی دعوت دی۔ رسمی دعوت نہیں بلکہ سچّی دعوت یعنی آپ نے

ایک باقاعدہ مشاعرے اور جلسے کا پروگرام طے کیا لیکن میرے پاس چونکہ وقت کم تھا اس لئے اُن سے معذرت طلب کی اور انھیں الوداع کہی ۔

جناب تابش اور خوب چند صاحب ابھی روانہ نہیں ہوئے تھے کہ ہمارے میزبان بخاری صاحب حیدر آباد سے تشریف لے آئے۔ آپ سے ملاقات ہوئی آپ نے آتے ہی مہمانوں سے اپنی غیر حاضری کی معذرت چاہی۔ آپ کی گھنی داڑھی دیکھ کر بھی مجھے وہی اندیشہ لاحق ہوا جو محمد حسین صاحب کی داڑھی دیکھ کر ہوا تھا۔ لیکن داڑھی نے دونوں موقعوں پر دھوکا دیا آخر اس دور میں داڑھیوں سے اور توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے۔

یہاں سے فارغ ہوئے تو جناب منجیت ایک سینما گھر میں لے گئے وہاں تصویر دیکھنے کے بعد بے بی تبسّم اور اس کے والدین سے ملاقات ہوئی۔ بے بی تبسّم کی عمر سات برس کی ہے۔ لیکن اس کی اداکاری میں فن اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ جو تصویر ہم نے تھوڑی دیر پہلے دیکھی تھی اس میں بھی وہ کام کر رہی تھی۔ میں حیران ہوں کہ اس قدر کم عمر میں اس بچّی نے یہ ذہانت اور تربیت کہاں سے حاصل کی۔ بے بی تبسّم کے والدین اُردو سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں اور اُردو کے متعدد اخبارات و رسائل اپنے

یہاں منگواتے ہیں۔ تصویر دیکھنے کے بعد یہ ہمیں اپنی جائے قیام ایمبیسڈر[1] ہوٹل میں لے گئے۔ وہاں بے بی نے چاکلیٹ اور ٹافیوں سے ہماری تواضع کی تھوڑی دیر بعد اُن سے اجازت لے کر ہم اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔

یہ تو میں کہنا بھول ہی گیا کہ جب آرٹس کالج کے مشاعرے میں پہلی غزل پڑھنے کے بعد میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھا تو مولانا عبدالحق نے فرمایا کہ ۸ر کو ہم عثمانیہ کالج کرنول میں ایک مشاعرہ منعقد کر رہے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ آپ اس مشاعرہ میں شرکت کریں۔ ڈاکٹر صاحب کی اس فرمائش کو قبول نہ کرنا بہت مشکل تھا۔ میں آمادہ ہو گیا اور طے پایا کہ ۷ر کو مدراس سے چلیں گے۔

۷ر کی صبح کے متعلق یہ بھی فیصلہ ہوا کہ طلوعِ صبح کا منظر سمندر کے کنارے دیکھیں گے چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے صبح کے ساڑھے پانچ بجے سیر کا انتظام مکمّل کر لیا۔ میں ابھی سو ہی رہا تھا کہ پانچ بجے منجیت صاحب نے آجگایا۔ ہاتھ منہ دھو کر تیار ہوا کوئی آدھ گھنٹے میں ڈاکٹر صاحب کے فرزند انوار موٹر لے کر پہنچ گئے۔ راستے میں مختلف مناظر سے لطف اندوز ہوتے

---

[1] ہوٹل کا نام مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا۔ غالباً یہی نام تھا۔

ہوئے۔ ہم طلوع سے پہلے ساحلِ بحر پر جا پہنچے۔ تھوڑی دیر میں اُفق کے دامن میں بقول حفیظ ـــ

کرنوں نے زنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو

اور دیکھتے ہی دیکھتے نور کا ایک سیلاب ایک آتشیں گولے کو اپنے دامن میں لئے پانی کی سطح پر نمودار ہوا یہ منظر اس قدر حسین تھا کہ اسے بیان کرنا میرے بس میں نہیں۔ اسے دیکھتے ہی فانی کا یہ شعر یاد آیا ؎

ترے جلووں کے آگے طاقتِ شرحِ بیاں رکھ دی

زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی

ہم کوئی پندرہ بیس منٹ تک یہ منظر دیکھتے رہے اس کے بعد ساحلِ بحر سے کچھ سیپیاں چن کر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر آئے۔ وہاں چائے پی کر اسٹیشن پر پہنچے۔ کسی کو الوداع کہنا تھا اور ناشتے کے وقت تک اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹ آئے۔

اب کے ناشتے میں بخاری صاحب بھی شریک تھے۔ اُنھوں نے اپنی خوش گفتاری سے اپنی طویل غیر حاضری کی تلافی کر دی آپ نے کہا کہ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ میں نے خود اکثر دوستوں کو شاعری

میں شرکت کی دعوت دی اور جب ان دوستوں نے دعوت قبول کرلی تو مجھے ایک ضروری کام سے مدراس چھوڑکر حیدرآباد جانا پڑا۔

شام کو چار بجے گورنمنٹ آرٹس کالج کی اُردو ایسوسی ایشن کی جانب سے جلسئے، تصویر، تقریر اور کلام کی فرمائش تھی۔ منجیت صاحب اور جناب اشرف کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ تمام کاموں سے کوئی سات بجے تک فارغ ہوگئے۔ کھانا رات کا ڈاکٹر عبدالحق کے ہاں تھا۔ وہاں سے ساڑھے آٹھ بجے فارغ ہوکر دس پندرہ منٹ میں اسٹیشن پر پہنچے اور نو بجے کرنول کو روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن پر ایک فی البدیہ رباعی ہوئی۔ اور وہ اس موضوع پر کہ جب سے مدراس کے اسٹیشن پر اترا تھا طلبہ نے ہر موقع پر پھولوں کے ہار پہنانے میں کچھ بہت زیادہ فراخ دلی سے کام لیا تھا۔ رخصت کے وقت بھی یہی کیفیت تھی۔ چنانچہ روانہ ہوتے وقت میں نے ان سے کہا ؎

آزاد کو مول لے لیا ہے تم نے

یوں اس پہ طلسم سا کیا ہے تم نے

کانٹوں میں حیات جس کی گزری ہے تمام

پھولوں سے اُسے لاد دیا ہے تم نے

گاڑی چلی تو میں سو گیا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب بیدار ہوا۔ ہاتھ منہ دھو کر ناشتے سے فارغ ہوا۔ ساحل بحر پر طلوع کا منظر دل و دماغ پر اپنے مستقل نقوش چھوڑ گیا تھا۔ اب وہ نقوش صفحۂ قرطاس پر آنے کے لئے بے تاب تھے چنانچہ نظم کہنا شروع کی اور کرنول پہنچنے سے پہلے "مدراس کے ساحل پر" مکمل ہو چکی تھی۔

بارہ بجے کے قریب گاڑی کرنول پہنچ گئی۔ اسٹیشن پر عثمانیہ کالج کے پرنسپل اور اسٹاف کے بعض ممبر تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان سے تعارف ہوا اور ہم لوگ کالج کو چلے۔

یہ کالج جس میں اس وقت بلا امتیاز مذہب و ملت پانچ سو سے زیادہ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں ڈاکٹر مولانا عبدالحق کی کوششوں کا نتیجہ ہے تعلیم کی دُنیا میں ڈاکٹر عبدالحق کی خدمات اس قدر شاندار ہیں کہ وہ جنوبی ہند کے سرسید کے نام سے مشہور رہیں۔ کرنول ضلع کا صدر مقام ہے لیکن عثمانیہ کالج سے پہلے یہاں کوئی کالج نہ تھا۔ آپ نے تعلیم کے نام پر ملک کے متموّل طبقے کے سامنے جھولی پھیلائی اور کرنول میں ایک ایسا پودا لگایا جو آج ایک شجرِ سایہ دار کی صورت اختیار کر چکا ہے اور جس کے سائے میں آج

ہندوستان کی نئی نسل پروان چڑھ رہی ہے

کالج کے پرنسپل مولوی محمد میاں صاحب ایک شریف الطبع بزرگ ہیں۔ آپ بہار کے رہنے والے ہیں۔ دس بارہ برس تک یو۔پی کے محکمہ تعلیم کی خدمت کی اس کے بعد مدراس میں محکمۂ تعلیم کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ یہاں آپ ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کے عہدے پر ریٹائر ہوئے اور ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے اپنی خدمات عثمانیہ کالج کے سپرد کر دیں۔ عثمانیہ کالج خوش نصیب ہے کہ اُسے مولوی محمد میاں سا پرنسپل نصیب ہوا۔

مولوی صاحب نے کالج کا ماحول ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ کے شایانِ شان بنایا ہوا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اس میں ہر مذہب و ملت کے طلبہ تعلیم پا رہے ہیں بلکہ ہوسٹل میں جو دو کچن ہیں وہ ہندو اور مسلمان کے نام پر نہیں بلکہ ویجی ٹیرین اور نان ویجی ٹیرین کے نام پر ہیں اور میرے لئے یہ بات بہت تعجب خیز تھی کہ جہاں نان ویجی ٹیرین کچن میں ہندوؤں کی خاصی تعداد موجود ہے وہاں ویجی ٹیرین میں مسلمان کافی تعداد میں موجود ہیں۔ کالج میں سائنس اور آرٹ دونوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ علمی اور ادبی سرگرمیاں کالج میں زوروں پر ہیں۔ ہر قسم کے کھیل کا معقول

انتظام ہے۔ مختصر یہ کہ عثمانیہ کالج کا وجود اس علاقے میں ایک رحمت سے کم نہیں جہاں اسے قائم کرنے کا سہرا ڈاکٹر مولٰنا عبدالحق کے سر ہے وہاں اسے بطرزِ احسن چلانا مولوی محمد میاں صاحب اور اُن کے رفقاء کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

کالج کے وائس پرنسپل سعید صاحب کالج کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کی روح رواں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ طلبہ محبت کی حد تک آپ کا احترام کرتے ہیں اور آپ بھی اُن کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ جس دن میں کرنول سے روانہ ہوا اسی دن مولوی محمد میاں صاحب اور آپ کوئی ایک سو کے قریب طلبہ کو ہمپی (وجے نگر) کے کھنڈر دکھانے کے لئے گئے۔ گویا تعلیم کے اس پہلو کو بھی پوری اہمیت دی جا رہی ہے۔

شام کو اس کالج میں مولوی محمد میاں کی زیرِ صدارت اسلامک ہسٹری اسوسی ایشن کا اجلاس تھا۔ مجھ سے بھی اس میں نظم پڑھنے کی فرمائش کی گئی۔ چنانچہ میں بھی شریک ہوا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالحق نے علمِ تاریخ کی اہمیت پر ایک پُر معنی تقریر کی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یہ اجلاس برخاست ہوا۔ اس کے بعد چائے کی دعوت تھی۔ اس سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئے اور بہت دیر تک مختلف حضرات سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

یہ دن کالج کا ڈنر ڈے تھا۔ طلبہ ڈنر میں شرکت کی دعوت لے کر آئے۔ میں تو ہر حالت میں انھیں کا مہمان تھا۔ ڈنر میں شریک ہوا۔ ہندو اور مسلمان طلبہ کو ایک ہی جگہ کھانا کھاتے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ گویا عثمانیہ کالج کے طلبہ نے اس راز کو سمجھ لیا ہے کہ مذہبی تفریق کو ختم کیے بغیر کسی قسم کی انفرادی یا اجتماعی ترقی ناممکن ہے۔

رات کو مولانا عبدالحق نے ایک عظیم جلسے میں اپنے حج کے تاثرات بیان کیے۔ آپ مدراس کے مشاعرے سے چند دن ہی قبل حج سے واپس آئے تھے۔ کالج کو اڈرینگل حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک اپنی تقریر جاری رکھ کے آپ نے ایک طلسم سا باندھ دیا۔ آپ نے حج کی مشکلات بہت وضاحت سے بیان کیں اور کہا کہ بوڑھوں، بیماروں اور بچوں کے لئے یہ سفر بالکل لازمی نہیں ہے۔ سفر کی متعدد مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ہندوستان کا سو روپے کا نوٹ وہاں ستر روپے میں فروخت ہوتا ہے حالانکہ پچھلے سال اس کی قیمت چھیانوے روپے تھی اور اس سے قبل ایک سو دس روپے۔ پاکستان کا نوٹ جو خاص طور پر حج کے لئے جاری کیا گیا ہے ایک سو بیس اور ایک سو پندرہ روپے میں فروخت ہوتا ہے۔ آپ نے کہا کہ جب ہندوستانی حاجی کے پاس دس ہزار

روپے تھے وہ خود بخود وہاں سات ہزار میں تبدیل ہو گئے۔

دوسری صبح کو ڈاکٹر صاحب کرنول کے بعض تاریخی مقامات دکھانے کے لئے لے گئے۔ کالج کے قریب ہی ایک گنبد ہے جس میں سلاطینِ کرنول آرام فرماتے ہیں۔ ان قبروں میں فقط غلام رسول خاں کی قبر موجود نہیں۔ ان کے اجداد یہاں پہلو بہ پہلو سو رہے ہیں۔ غلام رسول خاں کرنول کے آخری تاجدار تھے اور راقم کے دل میں ان کا وہی مقام ہے جو حیدر علی، ٹیپو سلطان، انانا فرنویس یا جھانسی کی رانی کا ہے۔ ۱۸۳۸ء میں غلام رسول خاں نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی ایک اسکیم بنائی۔ اس اسکیم کے تحت کرنول میں ایک زمین دوز اسلحہ خانہ اور بارود خانہ قائم کیا گیا لیکن وقت سے پہلے یہ راز فاش ہو گیا۔ غلام رسول خاں گرفتار ہو گئے اور ریاست کو انگریزی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔ اس وقت بھی اگرچہ جاں باز سپاہیوں نے جنگ شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن غلام رسول خاں کو چونکہ اپنی رعایا کا خونِ ناحق گوارا نہ تھا اس لئے انھوں نے یہ کہہ کر کہ اب فتح کا امکان باقی نہیں رہا۔ اس امر کی اجازت نہ دی۔

بعد میں غلام رسول خاں رہا ہو کر ترچناپلی چلے گئے۔ جہاں اپنے ہی ایک سپاہی کے ہاتھ سے قتل ہوئے وہاں اُن کی قبر آج بھی موجود ہے۔

کرنول میں ان کے پوتے الف خاں سے میری ملاقات ہوئی۔ آپ بیس بائیس برس کے نوجوان ہیں۔ عثمانیہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ جنوبی ہند کے ایک ممتاز کھلاڑی ہیں اور انٹر یونیورسٹی مقابلوں میں متعدد انعامات حاصل کرکے کالج کے نام کو چار چاند لگا چکے ہیں۔

جس گنبد کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اُس کے فنِ تعمیر کا تھوڑا سا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں گنبد تو اس قسم کے ہندوستان بھر میں اکثر موجود ہیں لیکن اس کے ساتھ ۴۰×۸۰ کا ایک ہال موجود ہے جس کی چپٹی چھت پتھر کی سلوں سے بنائی گئی ہے اور یہ چھت بغیر کسی لوہے یا لکڑی کے سہارے کے آج تک جوں کی توں موجود ہے۔ گنبدوں کی بغیر سہارے کے گول چھتیں تو سمجھ میں آسکتی ہیں لیکن اس چھت کی تعمیر کو بڑے بڑے انجینیر بھی حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بعض انجینیروں کا یہ خیال تھا کہ اس کے اندر لوہے کے گرڈر یا سلاخیں موجود ہوں گی لیکن مختلف آلے لگا کر وہ اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پتھر کی سلوں کی یہ چپٹی چھت بغیر کسی سہارے کے ہے اور تعمیر کا یہ فن اپنے تخلیق کرنے والوں کے ساتھ ختم ہو گیا ہے

اس عظیم الشان گنبد اور ہال کے ٹیڑل وزن کو سہارا دینے کے لئے کوئی بیس گز کے فاصلے پر پتھر کی ایک مضبوط دیوار بنائی گئی ہے۔ اس دیوار کے نیچے دریائے اندراوتی بہتا ہے۔ یہ دریا آگے جا کر دریائے تنگ بھدرا میں ملتا ہے بنگم کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے افسوس کہ میں اُسے دیکھنے نہ جا سکا۔ دریا کے پار اشجار کے جھنڈ

ہیں اور جہاں یہ ختم ہوتے ہیں وہاں سے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دریا جنگل اور پہاڑ مل کر ایک عجیب منظر دکھاتے ہیں۔ میرے میزبانوں نے جس بالاخانے میں میرے قیام کا انتظام کیا تھا اس کے عین نیچے دریا بہتا تھا اور میں تینوں دن اس منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

شام کے چار بجے "کرنول میں اُردو" کے موضوع پر آغا حیدر حسن لکچرر عثمانیہ یونیورسٹی کی تقریر تھی۔ آپ حیدرآباد سے تشریف نہ لا سکے۔ چنانچہ ع

قرعۂ فال بہ نامِ منِ دیوانہ زدند

اور میں نے اُردو اور اس کے مستقبل کے متعلق کوئی بیس پچیس منٹ تک اپنے خیالات کا اظہار کیا رات کو مشاعرہ تھا۔ وہی کوا ڈرینگل پھر کھچا کھچ بھر گیا۔ اب کے بھی صدارت مولانا عبدالحق نے کی اور اپنے صدارتی فقرات سے مشاعرے میں جان ڈال دی۔ یہ مشاعرہ بھی صبح کے ڈیڑھ بجے تک جاری رہا متعدد مقامی شعراء نے شرکت کی۔ بزمِ اقبال کے صدر حضرت نوّاب اور سیکریٹری بھی شریک ہوئے۔ بزمِ اقبال شہر کی ایک ادبی انجمن ہے جس کے زیرِ اہتمام وقتاً فوقتاً ادبی اجلاس اور مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی چند دن بعد ایک مشاعرہ اس بزم کے زیرِ اہتمام منعقد ہونا تھا۔ مجھے اس میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی لیکن اب مزید قیام چونکہ ناممکن تھا۔ اس لئے میں نے معذرت چاہی۔ حضرت نوّاب کا تعلق کرنول کے شاہی خاندان سے ہے اور آپ کی بدولت شہر کی علمی و ادبی روایات ابھی تک بدستور چلی آتی ہیں۔

یہ مشاعرہ جب بامرِ مجبوری صبح کے ڈیڑھ بجے ختم کر دیا گیا ابھی اور بھی طول کھنچتا اگر ہمیں اس امر کا احساس نہ ہوتا کہ قریباً سو سوا سو طلبہ پر مشتمل ایک جماعت کو صبح چار بجے کی گاڑی سے اجنٹا کے کھنڈر دیکھنے کے لیئے روانہ ہونا ہے اور اس میں اکثر مشاعرے میں حصہ لینے والے طلبہ اور مشاعرے کے منتظمین شامل ہیں۔

کوئی دو بجے کے قریب فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں آیا اور اس رپورٹ کو جس کی ابتدا کرنول ہی میں ہو گئی تھی مکمل کرنا شروع کر دیا۔ جب طلبہ صبح چار بجے اسٹیشن کو روانہ ہونے لگے تو میں سو گیا اور ساڑھے سات بجے تک سوتا رہا۔ آج ایک بجے کی گاڑی سے دلی روانہ ہونا تھا۔ دن بھر کوئی کام نہ تھا بالکل فارغ رہا۔ کچھ وقت رپورٹ کی تکمیل میں صرف کیا۔ پھر زیدی صاحب آ گئے۔ اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔ ساڑھے بارہ کے قریب ہم سب اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالحق کو واپس مدراس جانا تھا۔ اُن کی گاڑی کا وقت ایک گھنٹہ بعد تھا لیکن میری گاڑی کچھ دیر سے آئی۔ لہذا دونوں قریباً ساتھ ہی ساتھ اسٹیشن پر پہنچیں۔ یہاں ڈاکٹر صاحب اور دوسرے احباب کو جنھوں نے اسٹیشن پر آنے کی زحمت کی تھی بادلِ ناخواستہ الوداع کہی اور میں یہ محسوس کرتا ہوا کرنول سے روانہ ہوا کہ ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں

۱۵ نومبر ۱۹۵۰ء

جگن ناتھ آزاد

پٹنے کی ایک رات

دہلی کتاب گھر، دہلی

پٹنے کی ایک رات

پٹنے کی ایک رات

جگن ناتھ آزاد

دہلی کتاب گھر دہلی

طبع اوّل

ایک ہزار

قیمت

چار آنے

پرنٹر :- محبوب المطابع اُردو بازار دہلی

پبلشر :- دہلی کتاب گھر دہلی

بہار کے اُن باہمّت نوجوانوں کے نام

جنہوں نے ناسازگار ماحول میں اُردو کا پرچم بلند کیا

اور اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کیا کہ اُردو کے حامی

ہندوستانی تمدّن کے علمبردار اور اُردو کے مخالف ہندوستان

کے عظیم تہذیبی اور تمدّنی سرمایے کے دشمن ہیں۔

پٹنے کی ایک رات

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں اُردو کانفرنسیں نہ جانے کیوں ایک عجوبے کی صورت اختیار کر گئی ہیں اور جب کبھی کہیں اُردو کا کوئی بڑا ادبی اجلاس منعقد ہوتا ہے تو اکثر حضرات بڑے تعجّب سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ نہ معلوم یہ حیرت و استعجاب کی کیفیت کب تک جاری رہے گی۔

حلقۂ ادب بہار کا دوسرا سالانہ اجلاس انہی بڑے اجلاسوں کی ذیل میں آتا ہے جن پر بالعموم حیرت و استعجاب کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ اجلاس ۱۴ مارچ ۱۹۵۱ء کو پٹنے میں منعقد ہوا۔ جناب آنند نرائن مُلا اور جناب سلام مچھلی شہری لکھنؤ سے، جناب اوپندر ناتھ اشک الٰہ آباد سے جناب خیر بھوروی علی گڑھ سے اور راقم دہلی سے اس اجلاس میں

شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ بہار کے طول و عرض سے ادیبوں اور شاعروں نے اس موقع پر جمع ہو کر صوبے میں اُردو کی رفتار کا جائزہ لیا۔ اور مستقبل کی روشنی میں اپنے مسائل پر غور کیا۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں سے جن حضرات کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں:۔

جناب سہیل عظیم آبادی، جناب اختر اورینوی، ڈاکٹر سیّد محمود، جناب عبدالقیوم انصاری، جناب خیر بھوروی، جناب اوپندر ناتھ اشک جناب آنند نرائن مُلا، جناب سلام مچھلی شہری۔ جناب نصرت آروی، جناب ابوالاحد نور، جناب عالم گورکھپوری، جناب وفا براہی۔ جناب عزیز عظیم آبادی جناب حمید عظیم آبادی اور جناب غلام سرور۔

شام کے چھ بجے اوپندر ناتھ اشک کی صدارت میں اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ جناب خیر بھوروی نے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کے مقاصد اور کارگزاری پر روشنی ڈالی او بہار میں ایک عظیم اُردو کانفرنس* کے انعقاد کی تجویز پیش کی۔

---

* یہ کانفرنس چار ماہ بعد پٹنے میں ۱۰، ۱۱ اور ۱۲ جولائی کو منعقد ہوئی۔

اس کے بعد اوپندر ناتھ اشک نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ اُردو اور ہندی کے اس نامور ادیب نے حالات کے پیشِ نظر اس نکتے کو واضح کیا۔ کہ درحقیقت اُردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ایک ہی زبان کے دو مختلف نام ہیں۔ دونوں کا فرق محض رسم الخط کا فرق ہے۔ اگر یہ فرق مٹ جائے تو اُردو اور ہندی کا جھگڑا آج ختم ہو سکتا ہے۔

خطبۂ صدارت ختم ہوا تو جناب شہاب الدّین محمّد سیکریٹری مجلس استقبالیہ مائکروفون کے سامنے تشریف لائے۔ آپ نے باہر سے آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے حالات اور واقعات کو ان الفاظ میں پیش کیا :-

"ہمارا دل اس وقت مسرّت اور شادمانی سے لبریز ہے کیونکہ ہم جائز طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ علم و فن کے اس قدیم صنم خانے میں جہاں علم و ادب، اخوّت و آشتی اور یکتی و شانتی کا چراغ آج سے سیکڑوں سال قبل گوتم بدھ نے روشن کیا تھا

اس کے اثرات متعدد اُردو کانفرنسوں کی صورت میں بہار کے دوسرے شہروں مثلاً داناپور، بتیا، مظفرپور اور مونگیر تک پہنچے۔

اسے ہلاکت و نفرت، بغض و حسد اور جہالت اور نادانی کے تیز جھونکوں سے محفوظ رکھنے میں ہم پوری جدوجہد کر رہے ہیں۔

....

اُردو زبان و ادب اسی قدیم متحدہ تہذیب، معاشرت اور روایات کا بچا کھچا اثاثہ ہے۔ جو کہ ہندو اور مسلمانوں کی ثقافتی، اخلاقی اور معاشرتی قدروں کا سنگم ہے۔ آج ایک طبقہ بڑے شد و مد کے ساتھ اس سنگم کو نیست و نابود کرنے کی کوششیں کر رہا ہے اور ہر ممکن کوشش اس کی پائیدار اور مضبوط بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی ہو رہی ہے۔ مگر کیا ہم، آپ یا دنیا کے سارے لوگ گنگا اور جمنا کے دھاروں کو پھیر کر اس کا سنگم تباہ کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور اتحاد کا یہ پریاگ کبھی برباد نہ ہو سکے گا۔ ہم اپنے فرض سے بے خبر نہیں۔ اُردو زبان و ادب کو آخری منزل تک پہنچانے کے لئے ہماری صدائیں، ہماری تحریکیں، ہماری کوششیں سب جاری ہیں۔ اگر ایک جانب تخریبی قوتیں بڑھ بڑھ کر حملے کر

رہی ہیں تو دُوسری جانب تعمیری قوتیں بھی بڑے شدّ و مدّ سے
برسرِ پیکار ہیں۔ ان تعمیری قوتوں کے ساتھ اگر نیاز، جوش،
سرور، احتشام ہیں تو کرشن چندر، آنند نرائن ملّا، جگن ناتھ آزاد
راجندر سنگھ بیدی، فراق گورکھپوری اور اوپندر ناتھ اشک بھی
ہیں۔ ہم اہلِ بہار بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان تعمیری
قوتوں کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔"
استقبالیہ کمیٹی کے سیکریٹری کے بعد جناب غلام سرور سیکریٹری حلقۂ ادب
نے گزشتہ سال کی روداد سنائی اور کہا:۔
"۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو اِدھر آزادی کا گجر بجا اور اُدھر دُنیا
پر ایک مایوسی، سراسیمگی، پریشانی، جمود، تعطل اور بحران چھا گیا۔ ہم
غلط طور پر یہ سمجھنے لگے کہ اب سوتنتر بھارت میں اُردو کیلئے کوئی
جگہ نہیں۔ کیونکہ یہاں کی راشٹر بھاشا اب ہندی ہوگی جو دیوناگری
لپی میں لکھی جائے گی۔ . . . .
. . . .
ہم نے ٹھنڈے دل سے ماحول کا جائزہ لیا اور اس

نتیجے پر پہنچے کہ یہ خوف وہراس، یہ مایوسی و پریشانی سراسر غلط ہے اور ہم نے ستمبر ۱۹۴۸ء میں "حلقہ احبابِ نوجوان" نامی ادبی انجمن کی بنا ڈالی پہلے ہم مقامی طور پر پٹنے میں کام کرتے رہے۔ جلد ہی ہم نے آل انڈیا اردو کانفرنس اور مشاعرہ منعقد کیا۔ کانفرنس کی کامیابی سے ہمارا حوصلہ بڑھا اور ہم نے انجمن ترقی اردو سے مل کر چند ماہ بعد ہی بہار اردو کانفرنس کی۔ یہ بھی توقع سے زیادہ کامیاب رہی اور خصوصاً "حلقہ احباب نوجوان" کی پیش کردہ تمثیل "صوبہ بہار کی گزری ہوئی روحوں کا مشاعرہ" ہمارا عزم پختہ تر ہوتا گیا۔ حلقۂ ادب بہار کا باضابطہ قیام ۲۵۔ اپریل ۱۹۴۹ء کو عمل میں آیا۔ اور دوسرے سال ہم نے اپنا پہلا سالانہ اجلاس و مشاعرہ منعقد کیا۔ ہم نے یہ محسوس کر لیا کہ کم از کم ہمارے صوبے میں اب نہ وہ گھبراہٹ ہے، نہ پریشانی اور جمود و تعطل۔ ہمارے قدم مضبوطی سے جم گئے۔ ہم نے سارے صوبے میں یوم اقبال منایا اور خوب منایا۔ یومِ پریم چند سارے صوبے میں منایا گیا اور کامیاب طور پر منایا گیا اور ہماری شاخوں کی، جو سارے صوبہ میں

پھیلی ہوئی ہیں، ہفتہ وار، پندرہ روزہ یا ماہانہ نشستیں ہوتی رہیں سارے صوبے میں ایک ادبی لہر دوڑ گئی اور مردہ روحوں میں مانو ایک زندگی آ گئی۔ گزشتہ سال ہماری بیشتر شاخوں نے اپنا سالانہ اجلاس بھی منعقد کیا۔ ۱۴ مئی کو پٹنہ شاخ کا سالانہ اجلاس ہوا جو بہت کامیاب رہا۔ نومبر میں مونگیر شاخ نے عام انعامات کا اعلان کیا۔ دسمبر میں حلقہء ادب پٹنہ اور انجمن ترقی پسند مصنفین پٹنہ نے مل کر یہ طے کیا کہ ماہانہ جوائنٹ نشستیں ہوا کریں جس میں باوجود اصولی و بنیادی اختلافات کے مشترک باتوں میں ایک پلیٹ فارم بنایا جائے۔ اس سال جنوری میں رانچی شاخ نے اپنا نیا انتخاب کیا۔ فروری میں شیخپورہ شاخ نے ایک شاندار اجلاس اور مشاعرہ منعقد کیا۔ ماہ رواں میں داناپور شاخ نے بھی اپنی نئی ترتیب کی۔ اور اب ہم ایک نئے جوش، بلند حوصلوں اور اعلیٰ ارادوں سے اپنا دوسرا سالانہ اجلاس کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔ میں اپنے تمام ممبروں کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں اور بلاخوف تردید یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ صوبے کے نئے لکھنے والوں میں ایک

نئی اُمنگ اور جاگرتی پیدا کرنے میں ہمارا بھی ہاتھ ہے۔ آج ہمارے حلقے میں ایسے حضرات شامل ہیں جو اُردو زبان کے صرف پرچارک ہی نہیں اُردو ادب کے مصنّف، شاعر، افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس بھی ہیں اور اُن کے فن پارے ملک کے معیاری پرچوں، رسالوں اور اہلِ فن سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

اس کے بعد آپ نے حکومت اور عوام سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان کی اس مقبول زبان کی جانب اپنا فرض ادا کریں اور اسے پھر وہی مقام دیں جس کی یہ مستحق ہے۔

یہ کارروائی کوئی تین گھنٹے تک جاری رہی اور نو بجے راقم کی صدارت میں مشاعرہ شروع ہوا۔ مشاعرے کا افتتاح جناب آنند نرائن مُلا نے کیا آپ نے اپنی افتتاحی تقریر میں یُو۔پی اور بہار کے مشاعروں پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے اہلِ بہار کی ہمّت کو سراہا اور انہیں چند مُفید مشورے دئے۔

راقم نے اپنی مختصر سی تقریر میں کہا کہ جناب آنند نرائن مُلا اور دُوسرے بزرگ شعراء کی موجودگی میں مجھ سے صدارت کی فرمائش کرنا ملک کے نوجوان طبقے کو ایک اشارہ ہے کہ اب بزرگوں کی رہنمائی میں اُسے

اُردو کی خدمت کا بوجھ سنبھالنا ہے۔ مَیں اِس جذبے کے تحت بخوشی اس مشاعرے کی صدارت کا فرض اپنے ذمّے لیتا ہوں۔

اس تقریر کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ یہ مشاعرہ جو آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے براڈکاسٹ ہوا کوئی گیارہ بجے تک جاری رہا۔ مشاعرے کی ابتدا آنند نرائن مُلّا کی غزل سے ہوئی۔ مُلّا کے علاوہ نصرت آردی۔ عالم گورکھپوری وفا براہی، اوپیندرناتھ اشک۔ عزیز عظیم آبادی، اختر اورینوی، حمید عظیم آبادی سلام مچھلی شہری اور جگن ناتھ آزاد نے اس مشاعرے میں حصّہ لیا۔ گیارہ بجے کے بعد براڈکاسٹنگ کا پروگرام ختم ہوگیا۔ لیکن یہ ادبی نشست اس کے بعد بھی بہت دیر تک جمی رہی۔

دہلی

۲۲ مارچ ۱۹۵۱ء

وطن میں اجنبی

پاکستان کے موضوع پر سینکڑوں اشعار کی ایک معرکتہ آلارا نظم جو اُردو کے شعری ادب میں ایک انوکھا اور جاودانی اضافہ ہے۔ ہندو پاکستان کے مقتدر نقادوں کی رائے میں اِس انداز کی نظم اُردو میں اِس سے پہلے کبھی پیش نہیں کی گئی۔

اِس نظم کے متعلق ۶ مئی ۱۹۵۱ء کے انڈو مینین مشاعرے پر تبصرہ کرتے ہوئے "ڈان" کراچی نے لکھا

His long poem "Pakistan" and other ghazals were widely acclaimed. Azad glorified Punjab in his verses and called it the divine land which had nurtured Iqbal, and also generations that bore his message as well as those of other seekers of truth. He called it the land of sweet lyrics and spiritual poetry and talked almost hysterically about Waris Shah, Hir Ranjha and Sohni Mahiwal..

Azad is a product of our best literary traditions, now in Bharat and carrying on a crusade for the existence and glory of Urdu in his country.

اُردو شاعری اِس نظم کا جواب مدتوں پیدا نہ کر سکے گی۔

جگن ناتھ آزاد

اُردو

دہلی کتاب گھر دہلی

بحکم خدا و خرد

Ex Libris

Asaf Ali-Asghar Fyzee

Presented to the Library of

The University of Jammu & Kashmir

June 1, 1957

اُردو

جگن ناتھ آزاد

دہلی کتاب گھر، دہلی

تعداد اشاعت
ایک ہزار

قیمت
چھ آنے

پرنٹر :- محبوب المطابع برقی پریس دہلی

پبلشرز :- دہلی کتاب گھر، دہلی

اُردو

جو آزاد نے ۱۹ ستمبر ۱۹۵۰ء کو اُردو مجلس

دہلی کی پہلی سال گرہ کی تقریب پر جب کہ

تقسیمِ ہند کے بعد پہلی بار دہلی میں

انجمن ترقّیٔ اُردو (ہند) کی شاخ قائم

ہوئی خواجہ حسن نظامی کی زیرِ صدارت

ڈیویکوز کے ہال میں پڑھی

انجمن ترقّیٔ اُردو لائل پور

(پاکستان)

کے نام

جس نے میرے لڑکپن کے زمانے میں
میرے ذوقِ ادب کو سنوارا اور اپنی
محبّت اور خلوص کا ایک ایسا نقش
میرے دل و دماغ پر ثبت کیا جس
کی تجلّی اور گرمی آج بھی مَیں
حریمِ جاں میں محسوس کر رہا ہوں

شہزاد

پیش نامہ

صرف یہ کہنا بالکل کافی نہیں کہ جگن ناتھ آزاد کی یہ نظم بہت اچھی ہے
مَیں حال ہی میں آزاد کی شاعری سے آشنا ہُوا ہُوں۔ گذشتہ اگست میں مَیں نے اُن کے کلام کے مجموعہ "بیکراں" پر "ہماری زبان" میں مختصراً اپنے اِن تاثرات کا اظہار کیا تھا کہ "آزاد ہندستان کے اس دوسرے جنم کے نقیب ہیں لیکن وہ اس کے قایل نہیں کہ "ایک ہی قدم میرے لئے بس ہے"۔ وہ آزاد ہندستان کی آزادی سے بھی کچھ آگے بڑھنا چاہتے ہیں"۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ہماری آزادی کی تکمیل — ذہنی، سماجی اور اخلاقی — ابھی باقی ہے اور اس تکمیل کے لئے "ہماری نئی دُنیا کے نئے ادب اور شعر کے نئے پیغمبروں اور نئے اوتاروں کی ضرورت ہے"۔ آزاد کے کلام کا اس قدر گہرا اثر میرے دل پر اس لئے پڑا ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء کے فرقہ واری فتنہ کی آگ میں گذر کر اور آوارۂ وطن ہو کر ہندستان آئے اور پھر بھی ادنیٰ تعصّبات کی اُس گندگی سے اُنہوں نے اپنا دامن بچا لیا جس سے آج بہت سے دامن آلودہ ہیں۔ یہ شخصی کردار کا ایک بہت بلند مقام ہے!! ایک ایسے شاعر کی آواز کو محض شاعرانہ

سخن آرائی تو نہیں کہہ سکتے! وہ تو غیب کی آواز ہے، وہ تو زندگی کی ایک نوید ہے!

یہ نظم جواب شائع ہوتی ہے "اُردو زبان" کے متعلق آزاد کی بلند نظری کا ایک نقش ہے، جس کی تعریف مَیں اس لئے نہیں کرتا کہ میری مادری زبان اُردو ہے یا مَیں انجمن ترقیٔ اُردو کا سکریٹری ہوں بلکہ اس لئے کرتا ہوں کہ یہ نظم اُردو زبان کے ارتقا کی تاریخ کا ایک جزو ہے اور اس میں ہمیں اس حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے کہ اُردو ہمارے ملک کی مشترکہ زبان تھی اور ہے۔ اُس کے چہرے کو آج ہمارے مُلک کے بہت سے لوگ دیکھنا پسند نہیں کرتے، لیکن تاریخ اور زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ بند کر کے انکار کر دینا اُن کو باطل نہیں کر سکتا! تاریخ کے گواہ تصنّع پسند اور سخن ساز سیاست کی سخت ترین ضربیں کھا کر بھی زندہ رہا کرتے ہیں۔

آزاد کی ذہنی زندگی روشن اور تاباں ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی ہی رہے گی، گرد و غبار سے پاک! اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اُن کے چراغ سے ہزاروں چراغ ہمارے عزیز وطن میں روشن ہوں گے اور ایک دن آئے گا کہ اس ملک میں شاعروں کی شاعری اور ادیبوں کا ادب عوام کی زندگی کا اس طرح آئینہ دار ہوگا کہ پھر عکس کو آئینہ سے جُدا نہ کیا جا سکے گا۔

علی گڈھ

۳۰ دسمبر ۵۶ء

(قاضی) محمد عبدالغفار

اُردُو

غالباً یہ ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے۔ انجمنِ ترقّیٔ اُردو لائل پور نے علّامہ برج موہن کیفی کے اعزاز میں ایک ادبی جلسہ منعقد کیا تھا اور مجھے لاہور سے اس جلسہ میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ مَیں بالعموم مخصوص تقریبوں میں اپنی عام ادبی چیزیں پڑھ دیا کرتا ہوں۔ لیکن اس تقریب کے لئے میں نے خاص طور پر ایک نظم کہی۔ بدقسمتی سے مَیں جس وقت لائل پور پہنچا تقریب ختم ہو چکی تھی اور میرے میزبان تقریب میں شرکت کے بعد گھر واپس آ چکے تھے مجھے اس محفل میں شریک نہ ہونے کا افسوس ہُوا اور نظم کاغذات ہی میں دھری رہ گئی۔

۱۹۴۷ء میں مَیں لاہور سے چلا تو اس بے ترتیبی سے کاغذ جمع کئے کہ اکثر کام کی چیزیں ـــــ کتابیں مسودے وغیرہ وہیں رہ گئے اور ردّی کاغذات کے پلندے جلدی میں جمع کی ہوئی چیزوں کے ساتھ یہاں دلّی آ گئے۔ چند ماہ ہوئے یہ کاغذات دیکھ رہا تھا کہ ان

میں سے یہ نظم برآمد ہوئی اور اس خیال کے پیشِ نظر کہ نئے حالات میں اس کی اہمیت شاید کم نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے بڑھ گئی ہے اسے موجودہ صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ تمہید اس لئے لکھی ہے کہ پڑھنے والے اس نظم کو تازہ نہ سمجھیں کیونکہ اُردو سے جو توقعات اس نظم میں وابستہ کی گئی ہیں اُن میں سے اکثر پوری نہیں ہوئیں ہاں جن جذبات کا مَیں نے اظہار کیا ہے وہ آج بھی میرے ہیں اور تقسیم ہند اور اس سے پیدا ہونے والے واقعات اُنہیں مجھ سے چھیننے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

سُنا ہے ہند پر یُوں حکمراں تھی آلِ تیمُوری

کہ مُلک اک جسم تھا اور اس میں جاں تھی آلِ تیموری

یہ تھا دَورِ آدمیت کا، شرافت کا، مروّت کا

وطن میں یہ زمانہ تھا زمانہ امن و راحت کا

ہوئیں شیر و شکر اس طرح دو اقوام آپس میں

کہ پھیلیں ہر طرف ہندوستاں میں پیار کی رسمیں

اکھٹے ہندو و مُسلم شریکِ حُکمرانی تھے

وطن کے پاسباں مِل جُل کے محوِ پاسبانی تھے

اِدھر بھی اک تمدّن تھا اُدھر بھی اک تمدّن تھا

نظر آیا وطن کی سرزمیں پر اک حسیں نقشہ

نہ کیوں اس گلستاں میں ارتقا کے پھول پیدا ہوں

جہاں پہلو بہ پہلو دو تمدّن کارفرما ہوں

جہانِ علم پر چمکے مثالِ کہکشاں ہندی

حکومت کی زباں تھی فارسی اپنی زباں ہندی
عنادل نغمہ آرا تھے ادب کے گلستانوں میں
اضافہ ہو رہا تھا اس طرح دونوں زبانوں میں

مگر اس میں قباحت کا بھی اک پہلو نظر آیا
عمل کی زندگی میں جو مسلسل مشکلیں لایا
ملے ہندوستانی سے جو باہم ترک و ایرانی
تو مشکل ہو گئی اک دوسرے کو بات سمجھانی
بہت مشکل نظر آیا یہ باہم ربط کا عالم

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

خلوصِ قلب سے لیکن یہ مشکل حل ہوئی آخر

نئی اک گفتگو کی طرز دونوں کو ملی آخر

وہ طرزِ گفتگو آزاد! کچھ ایسی حسیں نکلی

کہ ان دونوں زبانوں سے زیادہ دلنشیں نکلی

کیا "اُردو" بالآخر وقت نے تجویز نام اس کا

مروّت اس کا شیوہ تھا جہانگیری تھا کام اس کا

یہ عُقدہ حل کیا جس نے وہ دورِ شہجہانی تھا

یہ دَورِ شہجہانی تھا کہ لطفِ آسمانی تھا

ہمارے دیس کے اُجڑے گلستاں میں بہار آئی
ہُوئی اک طرزِ نو پر اس وطن میں محفل آرائی

مگر دورِ فلک کو یہ طریقہ ناپسند آیا
محبّت کا، مروّت کا سلیقہ ناپسند آیا
حقیقت ہو گئی پنہاں، فسانے ہو گئے پیدا
لڑائی اور جھگڑے کے بہانے ہو گئے پیدا
نتیجہ یہ ہُوا افسانہ بن کر رہ گئی اُلفت
بس اک ٹوٹا ہُوا پیمانہ بن کر رہ گئی اُلفت

ہوائے وقت نے تاریخ کا جس دم ورق اُلٹا
تو یاروں کی زبانوں پر نظر آیا سبق اُلٹا
نگاہوں میں محبّت کی جگہ نفرت نظر آئی
تجلّی گُم ہوئی چاروں طرف ظلمت نظر آئی
ہوئے نصرت نصیب اس طرح سے آفت کے پرکالے
محبّت کھیل ہاری اور جیتے دُشمنی والے

یہی وہ دَورِ نو ہے جس میں ہم اب سانس لیتے ہیں
اِسی کیچڑ کی ندّی میں ہم اپنی ناؤ کھیتے ہیں

یہی وہ دَور ہے ورثے میں جو اب ہم نے پایا ہے
کسی سے کیا کہیں کیا ہم نے پایا کیا گنوایا ہے
یہی وہ دَور ہے جس پر تمدّن ناز کرتا ہے
اسی کا لمحہ لمحہ عرش تک پرواز کرتا ہے
یہی وہ دَور ہے جس کو بڑی جدّت کا دعویٰ ہے
بڑی جدّت کا دعویٰ ہے بڑی ندرت کا دعویٰ ہے

نہ اب وہ پیار کی باتیں نہ وہ اخلاص باقی ہے
نہ اب وہ پینے والے ہیں نہ وہ مے ہے نہ ساقی ہے

صفا و صدق جو مفقود ہیں آج اپنے سینوں سے

کبھی وہ دِن بھی تھے ظاہر تھے جب اپنی جبینوں سے

مگر اک چیز بچھڑوں کو مِلا سکتی ہے. جو اَب بھی

ہمارے مُلک کی بگڑی بنا سکتی ہے جو اَب بھی

مِلا سکتی ہے جو' وہ صدق کی زنجیر باقی ہے

جو دیکھیں غور سے اے دوست! وہ تعمیر باقی ہے

بنا رکھّی گئی تھی جس کی دَورِ شہجہانی ہیں

مگر افسوس اب یورش ہے جس پر بدگمانی ہیں

یہ وہ شئے ہے جو لائے ایک مرکز پر حریفوں کو

مئے کہنہ پلائے ایک مرکز پہ حریفوں کو
غلط ہے جو سمجھتا ہے اسے اغیار کی بولی
یہ ہے اخلاص کی طرزِ تکلّم، پیار کی بولی

ذرا اے معترض! اک لمحہ کی زحمت گوارا کر
مرے ہمراہ آ، اور بزمِ اُردو کا نظارا کر
یہ وہ محفل ہے جس میں برق و چکبست و سرور آئے
کہ جن کے شعر پڑھ کر فکرِ انسانی میں نُور آئے
یہ وُہ محفل ہے زینت جس کی ہے سرشار کے دم سے

نسیمِ خوش بیاں کی طبعِ گوہربار کے دم سے

جمالستان کا محرم فراق اِس میں نظر آئے

یہ وہ محفل ہے تفنۃ سا سخنور جس کو اپنائے

مرے والد سا بھی فن کار اِس محفل میں شامل ہے

وفا ایسا فسوں گفتار اِس محفل میں شامل ہے

ہری چند اختر اِس میں عرش اس میں جوش ہے اِسمیں

شرابِ علم و فن کا آج ہر مدہوش ہے اِس میں

یہاں موجود ہے بیدی، اوپندر ناتھ ہے اِس میں

کنھیا لال ہے اس میں مہندر ناتھ ہے اِس میں

کوشلیا، ساگر اور بلونت سے ہیں پختہ کار اِس میں
ہوئے ہیں کرشن سی ہستی کے جوہر آشکار اِس میں
مجھے بھی دیکھ مَیں بھی نغمہ خواں اِس انجمن میں ہُوں
(مجھے بھی ہے یقیں اس بات کا اپنے چمن میں ہُوں)
یہاں ستیہ ارتھی بھی، دیوتی بھی اور در بھی ہے
یہ محفل اپنی منزل بھی ہے اپنی رہگزر بھی ہے
اِسی محفل میں ملّا کے سکوں پرور ترانے ہیں
اِسی میں ضوفگن پرکاش پنڈت کے فسانے ہیں
یہ وہ محفل ہے جس کا صدرِ محفل آج ہے کیفی

ہمارے ملک کے شعر و ادب کا تاج ہے کیفی

وہ کیفی ناز فرماتا ہے آج اُردو ادب جس پر

علمبردارِ حکمت کاروانِ فکر کا رہبر

اسی کے دم سے دیکھ آج اس بھری محفل کا نظارا

یہی ہے آسمانِ علم کا روشن تریں تارا

کیفی

سلام اے محسنِ اردو! سلام اے حامئ اُردو!

بدل ڈالی ہے تو نے حُسن میں ہر خامئ اُردو

اِسے تو نے کچھ اِس انداز سے سانچے میں ڈھالا ہے
کہ اب چاروں طرف اُردو زباں کا بول بالا ہے

بجا ہے گر تجھے معمارِ تعمیرِ ادب کہئے
تجھے فخرِ زبانِ ہند، توقیرِ ادب کہئے

سلام اے حامیٔ اُردو، سلام اے محسنِ اُردو!
ترا ہر نقش ہے نقشِ دوام اے محسنِ اُردو

تری تقریر پہ اُردو زباں خود ناز کرتی ہے
تری تحریر پہ طرزِ بیاں خود ناز کرتی ہے

اسی کیفی، اسی فخرِ ادب کی ہے زباں اُردو

عداوت کی فضا میں ہے محبّت کا بیاں اُردو

اسے اہلِ وطن دیکھیں نہ ہرگز بدگمانی سے

کہ دُھل کر آئی ہے یہ زمزم و گنگا کے پانی سے

ریاضِ ہند میں اُردو وہ اِک خوش رنگ پودا ہے

جسے خونِ جگر سے ہندو و مسلم نے سینچا ہے

مرے اہلِ وطن یہ آدمیّت کا تقاضا ہے

محبّت کا، حمیّت کا، شرافت کا تقاضا ہے

کہ ہم پامالِ جورِ آسماں ہونے نہ دیں اس کو

خزاں کے دَور میں وقفِ خزاں ہونے نہ دیں اس کو

وطن بھی ایک ہے اپنا، زباں بھی ایک ہو اپنی

قفس جب ایک ہے طرزِ فغاں بھی ایک ہو اپنی

جگن ناتھ آزاد

اُردو

دُوسرا ایڈیشن

مکتبۂ قصرِ اُردو دہلی

اُردو

جگن ناتھ آزاد

مکتبۂ قصرِ اُردو، دہلی

پہلی بار مارچ سنہ ۱۹۵۱ء

دُوسری بار دسمبر سنہ ۱۹۵۲ء

قیمت آٹھ آنے

پرنٹر :- محبوب المطابع برقی پریس دہلی

پبلشرز :- مکتبۂ قصرِ اردو، اُردو بازار - دہلی

اُردو

جو آزاد نے ۱۹ ستمبر ۱۹۵۰ء کو اُردو مجلس

دہلی کی پہلی سال گرہ کی تقریب پر جب کہ

تقسیم ہند کے بعد پہلی بار دہلی میں

انجمن ترقی اُردو (ہند) کی شاخ قائم

ہوئی، خواجہ حسن نظامی کی زیر صدارت

ڈیویکنز ہال میں پڑھی

اِس حقیقت کے نام

کہ اُردو ہندوستان کی ایک ترقّی یافتہ

اور ترقّی پسند زبان ہے اور ہندوستانی

تہذیب و تمدّن کا باغ اس پھول کے

بغیر کسی طرح مکمّل نہیں سمجھا جاسکتا

پیش نامہ

صرف یہ کہنا بالکل کافی نہیں کہ جگن ناتھ آزاد کی یہ نظم بہت اچھی ہے
میں حال ہی میں آزاد کی شاعری سے آشنا ہوا ہوں۔ گذشتہ اگست میں میں
نے اُن کے کلام کے مجموعہ "بیکراں" پر ہماری زبان میں مختصراً اپنے اِن
تاثرات کا اظہار کیا تھا کہ "آزاد ہندستان کے اِس دُوسرے جنم کے نقیب ہیں
لیکن وہ اس کے قایل نہیں کہ "ایک ہی قدم میرے لئے بس ہے"۔ وہ آزاد ہندستان
کی آزادی سے بھی کچھ آگے بڑھنا چاہتے ہیں"۔ میرا مطلب یہ تھا کہ
ہماری آزادی کی تکمیل — ذہنی، سماجی اور اخلاقی — ابھی باقی ہے اور اِس
تکمیل کے لئے "ہماری نئی دنیا کے نئے ادب اور شعر کے نئے پیغمبروں اور نئے
اوتاروں کی ضرورت ہے۔" آزاد کے کلام کا اس قدر گہرا اثر میرے دل پر
اس لئے پڑا ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء کے فرقہ واری فتنہ کی آگ میں گذر کر اور آوارہ وطن
ہو کر ہندستان آئے اور پھر بھی اونے تعصبات کی اُس گندگی سے انہوں نے
اپنا دامن بچا لیا جس سے آج بہت سے دامن آلودہ ہیں۔ یہ شخصی کردار
کا ایک بہت بلند مقام ہے!! ایک ایسے شاعر کی آواز کو محض شاعرانہ

سخن آرائی تو نہیں کہہ سکتے! وہ تو غیب کی آواز ہے، وہ تو زندگی کی ایک نوید ہے!

یہ نظم جواب شائع ہوتی ہے "اردو زبان کے متعلق آزاد کی بلند نظری کا ایک نقش ہے، جس کی تعریف میں اس لئے نہیں کرتا کہ میری مادری زبان اُردو ہے یا میں انجمن ترقّی اُردو کا سکریٹری ہوں بلکہ اس لئے کرتا ہوں کہ یہ نظم اُردو زبان کے ارتقاء کی تاریخ کا ایک جزو ہے اور اس میں ہمیں اس حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے کہ اُردو ہمارے ملک کی مشترکہ زبان تھی اور ہے۔ اس کے چہرے کو آج ہمارے ملک کے بہت سے لوگ دیکھنا پسند نہیں کرتے، لیکن تاریخ اور زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ بند کر کے انکار کر دینا اُن کو باطل نہیں کر سکتا! تاریخ کے گواہ تعصّب پسند اور سخن ساز سیاست کی سخت ترین ضربیں کھا کر بھی زندہ رہا کرتے ہیں۔

آزاد کی ذہنی زندگی روشن اور تاباں ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی ہی رہے گی، گرد و غبار سے پاک! اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اُن کے چراغ سے ہزاروں چراغ ہمارے عزیز وطن میں روشن ہوں گے اور ایک دن آئے گا کہ اس ملک میں شاعروں کی شاعری اور ادیبوں کا ادب عوام کی زندگی کا اس طرح آئینہ دار ہوگا کہ پھر عکس کو آئینہ سے جدا نہ کیا جا سکے گا۔

علی گڑھ

۳۰ دسمبر ۵۸ء

(قاضی) محمّد عبدالغفّار

دیباچہ طبعِ ثانی

اِس نظم کا دوسرا ایڈیشن میں کسی قدر اضافے کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ اکثر شعراء اور ادباء کے نام جو اصل نظم میں موجود نہیں تھے، اب بڑھائے گئے ہیں۔ آخر میں ایک تعارف نامہ بھی شامل کر دیا گیا ہے تاکہ جس شاعر اور ادیب کا ذکر نظم میں آیا ہے اُس کے ادبی کارناموں سے بھی پڑھنے والے کو واقفیت ہو سکے

دو باتوں کی جانب یہاں میں خاص طور پر ناظرین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ فن کاروں کے ناموں کے ذکر میں کسی تاریخی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ جیسے جیسے فن کاروں کے نام خیال میں آتے گئے وہ نظم میں شامل ہوتے گئے۔ تاریخِ ادب کی کسی کتاب کو سامنے رکھ کر شعر کہنا میرے بس میں نہ تھا، اسی لئے ممکن ہے بعض اہم نام اس نظم میں شامل ہونے سے رہ گئے ہوں۔

دوسری بات ان فن کاروں کی کتابوں کے متعلق ہے۔ کوشش میں نے یہ کی ہے کہ ان مصنّفوں کی تمام کتابوں کا ذکر آ جائے لیکن چونکہ یہ فہرست بھی میں نے اپنی یادداشت سے مرتّب کی ہے لہٰذا اُس کے مکمل ہونے کے متعلق بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے بعض اہم کتابیں درج ہونے سے رہ گئی ہوں لیکن چونکہ نظم پیش کرنے کا مقصد مصنّفوں یا کتابوں کے نام گنوانا نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کو پیش کرنا ہے کہ اُردو کسی ایک طبقے کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ سارے ملک کی زبان ہے اور اس کی پرورش میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے حصّہ لیا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ناموں کی کمی بیشی مقصد کی صداقت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

دہلی۔ ۲۴ جنوری ۱۹۵۲ء

آزاد

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی

اقبال

تمہید

غالباً یہ ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے۔ انجمن ترقیِ اُردو لائل پور نے علامہ برج موہن کیفی کے اعزاز میں ایک ادبی جلسہ منعقد کیا تھا اور مجھے لاہور سے اس جلسے میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ میں بالعموم مخصوص تقریبوں میں اپنی عام ادبی چیزیں پڑھ دیا کرتا ہوں۔ لیکن اس تقریب کے لئے میں نے خاص طور پر ایک نظم لکھی۔ بدقسمتی سے میں جس وقت لائل پور پہنچا تقریب ختم ہو چکی تھی اور میرے میزبان تقریب میں شرکت کے بعد گھر واپس آ چکے تھے مجھے اس محفل میں شریک نہ ہونے کا افسوس ہوا اور نظم کاغذات ہی میں دھری رہ گئی۔

۱۹۴۷ء میں میں لاہور سے چلا تو اس بے ترتیبی سے کاغذ جمع کئے کہ اکثر کام کی چیزیں، کتابیں، مسوّدے وغیرہ وہیں رہ گئے اور ردی کاغذات کے پلندے جلدی میں جمع کی ہوئی چیزوں کے ساتھ یہاں دِلّی آ گئے۔ چند ماہ ہوئے یہ کاغذات دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے یہ نظم برآمد ہوئی اور اس خیال کے پیشِ نظر کہ نئے حالات میں اس کی اہمیت شاید کم نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے بڑھ گئی ہے اسے موجودہ صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ تمہید اس لئے لکھی ہے کہ پڑھنے والے اس نظم کو تازہ نہ سمجھیں، کیونکہ اُردو سے جو توقعات اس نظم میں وابستہ کی گئی ہیں اُن میں سے اکثر پوری نہیں ہوئیں، ہاں جن جذبات کا میں نے اظہار کیا ہے وہ آج بھی میرے ہیں، اور تقسیمِ ہند اور اس سے پیدا ہونے والے واقعات اُنھیں مجھ سے چھیننے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

دہلی۔ دسمبر ۴۷ء

اُردو

سُنا ہے ہند پر یُوں حکمراں تھی آلِ تیموری

کہ مُلک اک جسم تھا اور اُس میں جاں تھی آلِ تیموری

یہ تھا دورِ آدمیّت کا، شرافت کا، مروّت کا

وطن میں یہ زمانہ تھا، زمانہ امن و راحت کا

ہوئیں شیر و شکر اس طرح دو اقوام آپس میں

کہ پھیلیں ہر طرف ہندوستاں میں پیار کی رسمیں

اکٹھے ہندو و مُسلم شریکِ حکمرانی تھے

وطن کے پاسباں مِل جُل کے محوِ پاسبانی تھے

اِدھر بھی اک تمدّن تھا اُدھر بھی اک تمدّن تھا

نظر آیا وطن کی سرزمیں پر اک حسیں نقشہ

نہ کیوں اس گلستاں میں ارتقاء کے پھول پیدا ہوں

جہاں پہلو بہ پہلو دو تمدّن کارفرما ہوں

جہانِ علم پر چمکے مثالِ کہکشاں ہندی

حکومت کی زباں تھی فارسی اپنی زباں ہندی

عنادِل نغمہ آرا تھے ادب کے گلستانوں میں

اضافہ ہو رہا تھا اِس طرح دونوں زبانوں میں

مگر اس میں قباحت کا بھی اک پہلو نظر آیا
عمل کی زندگی میں جو مسلسل مشکلیں لایا

ملے ہندوستانی سے جو باہم ترک و ایرانی
تو مشکل ہو گئی اک دوسرے کو بات سمجھانی

بہت مشکل نظر آیا یہ باہم ربط کا عالم
"زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم"

خلوصِ قلب سے لیکن یہ مشکل حل ہوئی آخر
نئی اک گفتگو کی طرز دونوں کو ملی آخر

وہ طرزِ گفتگو آزاد! کچھ ایسی حسیں نکلی
کہ اِن دونوں زبانوں سے زیادہ دل نشیں نکلی

کیا "اُردو" بالآخر وقت نے تجویز نام اِس کا

مروّت اس کا شیوہ تھا جہانگیری تھا کام اِس کا

یہ عقدہ حل کیا جس نے وہ دورِ شہجہانی تھا

یہ دورِ شہجہانی تھا کہ لُطفِ آسمانی تھا

ہمارے دیس کے اُجڑے گلستاں میں بہار آئی

ہوئی اِک طرزِ نو پر اس وطن میں محفل آرائی

مگر دورِ فلک کو یہ طریقہ ناپسند آیا

محبّت کا، مروّت کا سلیقہ ناپسند آیا

حقیقت ہو گئی پنہاں، فسانے ہو گئے پیدا

لڑائی اور جھگڑے کے بہانے ہو گئے پیدا

نتیجہ یہ ہُوا افسانہ بن کر رہ گئی اُلفت

بس اک ٹوٹا ہُوا پیمانہ بن کر رہ گئی اُلفت

ہوائے وقت نے تاریخ کا جس دم ورق اُلٹا

تو یاروں کی زبانوں پر نظر آیا سبق اُلٹا

نگاہوں میں محبّت کی جگہ نفرت نظر آئی

تجلّی گم ہُوئی چاروں طرف ظلمت نظر آئی

ہُوئے نصرت نصیب اس طرح سے آفت کے پرکالے

محبّت کھیل ہاری اور جیتے دُشمنی والے

یہی وہ دورِ نَو ہے جس میں ہم اب سانس لیتے ہیں

اِسی کیچڑ کی ندّی میں ہم اپنی ناؤ کھیتے ہیں

یہی وُہ دَور ہے ورثے میں جواب ہم نے پایا ہے

کسی سے کیا کہیں کیا ہم نے پایا کیا گنوایا ہے

یہی وُہ دَور ہے جس پر تمدّن ناز کرتا ہے

اسی کا لمحہ لمحہ عرش تک پرواز کرتا ہے

یہی وہ دَور ہے جس کو بڑی جدّت کا دعویٰ ہے

بڑی جدّت کا دعویٰ ہے بڑی ندرت کا دعویٰ ہے

نہ اب وہ پیار کی باتیں نہ وہ اخلاص باقی ہے

نہ اب وہ پینے والے ہیں نہ وہ مے ہے نہ ساقی ہے

صفاو صدق جو مفقود ہیں آج اپنے سینوں سے

کبھی وہ دن بھی تھے ظاہر تھے جب اپنی جبینوں سے

مگر اِک چیز بچھڑوں کو مِلا سکتی ہے جو اب بھی
ہمارے ملک کی بگڑی بنا سکتی ہے جو اب بھی
مِلا سکتی ہے جو، وُہ صدق کی زنجیر باقی ہے
جو دیکھیں غور سے لے دوست! وہ تعمیر باقی ہے
بنا رکھّی گئی تھی جس کی دورِ شہجہانی میں
مگر افسوس اب یورش ہے جس پر بدگمانی میں
یہ وُہ شے ہے جو لائے ایک مرکز پر حریفوں کو
مئے کہنہ پلائے ایک مرکز پر حریفوں کو
غلط ہے جو سمجھتا ہے اسے اغیار کی بولی
یہ ہے اخلاص کی طرزِ تکلّم، پیار کی بولی

ذرا اے معترض! اک لمحہ کی زحمت گوارا کر
مرے ہمراہ آ، اور بزمِ اُردو کا نظارا کر
یہ وُہ محفل ہے جس میں برقؔ و چکبستؔ و سُرورؔ آئے
کہ جن کے شعر پڑھ کر فکرِ انسانی میں نور آئے
یہ وُہ محفل ہے زینت جس کی ہے سرشارؔ کے دم سے
نسیمِؔ خوش بیاں کی طبعِ گوہر بار کے دم سے
جمالستان کا محرم فراقؔ اس میں نظر آئے
یہ وُہ محفل ہے نفتہؔ سا سخنور جس کو اپنائے
مرے والا سا بھی فن کار اس محفل میں شامل ہے
وفا ایسا فسوں گفتار اس محفل میں شامل ہے

ہری چند اختر اس میں عرش اس میں جوش ہے اس میں

شراب علم و فن کا آج ہر مدہوش ہے اس میں

ہے افسانہ طرازِ بزم گیتی پریم چند اس میں

پرافشاں ہیں نظر کے نغمہ ہائے دردمند اس میں

منور جلوہ گر اس میں نظر شعلہ طراز اس میں

اُفق کے دل سے اُٹھے نالہ ہائے جانگداز اس میں

گہر کی آب اس میں مہر کی تابندگی اس میں

عیاں ہے امن کے اشعار کی رخشندگی اس میں

نگم نے اور جواہر سنگھ نے اس کو سنوارا ہے

کشن پرشاد سا فن کار اسی گردوں کا تارا ہے

بلندی اوج کے افکار کی ہے جلوہ گر اس میں
یہیں اعجازِ معجز ہے وفا کا ہے اثر اس میں
اسی محفل میں دیکھی اہلِ دل نے دل کی بیتابی
نظر آئی اسی میں گلشنِ مخلص کی شادابی
تسلّی کی نوا اس میں رواں رُوحِ رواں اس میں
مدن کی اور ساحر کی بلندی کا نشاں اِس میں
اِسی میں کیفِ دیوانہ اسی میں جذبِ پروانہ
اسی محفل کا لکھا صدرؔ نے جوہرؔ نے افسانہ
ہُوا ہنواریؔ آتش بیاں شعلہ طرازاس میں
سُنائے برہمن نے نغمہ ہائے دل نواز اِس میں

یہاں موجود ہے بیدی، اوپندر ناتھ ہے اس میں

کنہیا لال ہے اس میں مہندر ناتھ ہے اس میں

کوشلیا، ساگر اور بلونت سے ہیں پختہ کار اس میں

ہوئے ہیں کرشن سی ہستی کے جوہر آشکار اس میں

مجھے بھی دیکھ میں بھی نغمہ خواں اس انجمن میں ہوں

(مجھے بھی ہے یقیں اس بات کا اپنے چمن میں ہوں)

یہاں ستیارتھی بھی، ریوتی بھی الہ دتہ بھی ہے

یہ محفل اپنی منزل بھی ہے اپنی رہگزر بھی ہے

یہاں مخمور بھی ہے، شاد بھی ہے اور مبتلّا بھی

یہاں ہے تاجور بھی فکر بھی مضطر بھی ڈوگل بھی

اسی محفل میں مُلّا کے سکوں پرور ترانے ہیں

اِسی میں ضو فگن پیرِ نگارش نیدرت کے فسانے ہیں

فسانے اِس میں رہبر کے مضامیں اس میں شیدا کے

ہر اک جانب ہیں رقصاں ولولے شوقِ تمنّا کے

یہ وہ محفل ہے جس کا صدرِ محفل آج ہے کیفی

ہمارے ملک کے شعر و ادب کا تاج ہے کیفی

وہ کیفی ناز فرماتا ہے آج اردو ادب جس پہ

علمبردارِ حکمت کاروانِ فکر کا رہبر

اسی کے دم سے دیکھ آج اس بھری محفل کا نظارا

یہی ہے آسمانِ علم کا روشن ترین تارا

کیفی

سلام اے محسنِ اُردو! سلام اے حامیٔ اُردو

بدل ڈالی ہے تو نے حسن میں ہر خامیٔ اُردو

اسے تو نے کچھ اس انداز سے سانچے میں ڈھالا ہے

کہ اب چاروں طرف اُردو زباں کا بول بالا ہے

بجا ہے گر تجھے معمارِ تعمیرِ ادب کہیئے

تجھے فخرِ زبانِ ہند، توقیرِ ادب کہیئے

سلام اے حامیٔ اردو! سلام اے محسنِ اُردو!

ترا ہر نقش ہے نقشِ دوام اے محسنِ اُردو!

تری تقریر پہ اُردو زباں خود ناز کرتی ہے

تری تحریر پر طرزِ بیاں خود ناز کرتی ہے

اسی کیفی، اسی فخرِ ادب کی ہے زباں اُردو

عداوت کی فضا میں ہے محبّت کا بیاں اُردو

اسے اہلِ وطن دیکھیں نہ ہرگز بدگمانی سے

کہ ڈھل کر آئی ہے یہ زمزم و گنگا کے پانی سے

ریاضِ ہند میں اُردو وہ اک خوش رنگ پودا ہے

جسے خونِ جگر سے ہندو و مسلم نے سینچا ہے

مرے اہلِ وطن یہ آدمیّت کا تقاضا ہے

محبّت کا، حمیّت کا، شرافت کا تقاضا ہے

کہ ہم پامالِ جورِ آسماں ہونے نہ دیں اس کو

خزاں کے دَور میں وقفِ خزاں ہونے نہ دیں اِس کو

وطن بھی ایک ہے اپنا، زباں بھی ایک ہو اپنی

قفس جب ایک ہے طرزِ فغاں بھی ایک ہو اپنی

برق ۔ مہاراج بہادر برق دہلوی ۔ "مطلع الانوار"۔ "حرفِ ناتمام" اور "کرشن درپن" کے مصنّف

چکبست ۔ برج نارائن چکبست ۔ شاعر اور مضمون نگار ۔ شعر میں "صبحِ وطن" اور نثر میں "مضامینِ چکبست" آپ کی یادگار ہیں۔

سرور ۔ درگا سہائے سرور ۔ جوانمرگ شاعر۔ "خمخانۂ سرور" اور "جامِ سرور" کے مصنّف

سرشار ۔ رتن ناتھ سرشار ۔ "فسانۂ آزاد" آپ کی لازوال یادگار ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ کتابیں لکھیں۔ "کامنی" "خدائی فوجدار" "سیرِ کہسار" "جامِ سرشار" "ہشّو" "کڑم دھڑم" "بچھڑی دُلھن" اور "طوفانِ بے تمیزی"۔

نسیم ۔ دیا شنکر نسیم ۔ جنہوں نے گل بکاؤلی کے قصّے کو نظم کا جامہ پہنایا اور آج یہ "مثنوی گلزارِ نسیم" ریاضِ اُردو کا ایک ایسا پھول ہے جس تک خزاں کی رسائی ممکن نہیں ۔ اس کے علاوہ آپ کی غزلیات کا ایک دیوان بھی موجود ہے ۔

فراق ۔ رگھوپتی سہائے فراق ۔ محرمِ جمالیات ۔ عدیم المثال شاعر۔ بلند پایہ نقّاد۔ نظم و نثر میں متعدد کتابوں کے مصنّف ۔ تصانیفِ نظم :۔ "شعلۂ ساز" "شبنمستاں" "رمز و کنایات" "روپ" "مشعل"۔ تصانیفِ نثر :۔ "اندازے" "اُردو کی عشقیہ شاعری" وغیرہم

تفتہ ۔۔ مرزا ہر گوپال تفتہ ۔۔ مرزا غالب کے شاگردِ عزیز۔ اُردو اور فارسی کے قادر الکلام شاعر۔ اُردو میں متعدد نظمیں اور غزلیں کہی ہیں ۔ مجموعۂ کلام مرتّب نہیں کیا۔ فارسی میں تضمینِ گلستاں آپ کا ایک جاودانی کارنامہ ہے ۔ چار دیوان فارسی کے اس

کے علاوہ ہیں۔

محروم ــــ تلوک چند محروم ــــ "کلامِ محرومؔ حصّہ اول، حصّہ دوم، حصّہ سوم "گنجِ معانی" اور "رباعیاتِ محرومؔ" کے مُصنّف

وفا ــــ میلارام وفا ــــ اُردو کے نغمہ گو شاعر۔ "سوزِ وطن" آپ کی سیاسی نظموں کا مجموعہ ہے۔ نثر میں بھی آپ نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔

ہری چند اختر ــــ ہندوستان کا وہ نامور شاعر جس نے غزل کے قالب میں نئی رُوح پھونکی۔ پیغمبر اسلام کی شان میں آپ کی نعت اُردو ادب میں ایک غیر فانی مقام رکھتی ہے۔

عرش ــــ بال مکند عرش ملسیانی ــــ پختہ کلام اور منفرد شاعر۔ "ہفت رنگ" اور "چنگ و آہنگ" کے مصنّف

جوش ــــ ابو الفصاحت پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی۔ اُردو کے بلند پایہ شاعر مستند نقّاد اور ادیب، "بادہ سرجوش" اور "جنون و ہوش" آپ کے کلام کے دو مجموعے ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی "شرحِ دیوانِ غالبؔ" غالبیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

پریم چند ــــ مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

نظر ــــ پنڈت یوگ راج نظر سوہانوی ــــ مصنّف "شعلہ زار"۔ اس کے علاوہ آپ نے "کلامِ ربّانی" کے نام سے گیتا کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔

منوّر ــــ بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی ــــ "کائناتِ دل" کے مصنّف۔ بھگوت گیتا

کا آپ نے "نسیمِ عرفاں" کے نام سے اردو شعر میں ترجمہ کیا ہے۔ مہا کوی کالی داس کی مشہور تصنیف "کمار سنبھو" اور گوتم بدھ کی تلقینات کا بھی آپ نے نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ نثر میں آپ نے والمیکی رامائن کا ترجمہ کیا ہے۔

نظر — نوبت رائے نظر — "خدنگ نظر لکھنؤ"، اودھ اخبار لکھنؤ اور ادیب" الہ آباد کے ایڈیٹر رہے۔ "شامِ جوانی" آپ کا ایک مشہور ناول ہے۔

اُفق — دوارکا پرشاد اُفق — اردو کے نامور شاعر اور ادیب۔ مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنّف ہیں۔ مذہبی کتابیں:۔ رامائن منظوم۔ رامائن منظوم یک قافیہ۔ ترجمہ نثر رامائن والمیکی۔ ترجمہ مہا بھارت بھاگوت مختصر۔ بھگوت گیتا۔ سناتن دھرم پرکاش۔ یہ سناتن دھرم کی تاریخ اور اصول پر ایک مثنوی ہے۔ رام ناٹک۔ کرشن سُدامان۔
علمی و اخلاقی:۔ آئینۂ قواعد۔ مرقّع خیال۔ قواعدِ خوشخطی۔ سرمایۂ معلومات۔ مرقّعِ کمال، مُرقّع اخلاق۔

گُہر — حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔

مہر — سورج نرائن مہر۔ کلامِ مہر حصّہ اول، حصّہ دوم کے مصنف۔ بھگوت گیتا کا آپ نے رُباعیوں میں ترجمہ کیا ہے۔ "چہل درویش" آپ کی رُوحانی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

امن — گوپی ناتھ امن۔ اُردو کے نذر خدمت گزار اور باکمال شاعر۔ "کاروان و منزل" کے مُصنّف

نجم ــــ منشی دیا نرائن نجم ــــ جن کی خدمات "زمانہ" کانپور کے مدیر کی حیثیت سے کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

جواہر سنگھ ــــ جواہر سنگھ جوہر ۔ آپ کے کلام کے پانچ دیوان شائع ہوئے لیکن اب ایک بھی نہیں ملتا۔ متفرق غزلیں دستیاب ہوئی ہیں جن سے آپ کی قادر الکلامی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کشن پرشاد ــــ مہاراجہ سر کشن پرشاد۔ جن کے نام کے ساتھ اُردو ادب کے ایک اہم دور کی تاریخ وابستہ ہے۔

اوج ــــ گنگا پرشاد اوج بریلوی ــــ دیوانِ اوج آپ نے مرتّب کیا لیکن طبع نہ ہو سکا۔ ان کی زندگی کے بعد یہ نسخہ کہیں کھو گیا۔ اس وقت اُن کی چھبیس اشعار کی ایک غزل موجود ہے جو اُن کی شاعرانہ بلندیوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

معجز ــــ پنڈت دینا ناتھ معجز ــــ گیتا کا ترجمہ "مخزن الاسرار" آپ کی ماہرانہ فن کاری کی بہت بڑی دلیل ہے۔

وفا ــــ راجہ نول رائے وفا ــــ اُردو اور فارسی دونوں میں فکر کرتے تھے۔ اور دونوں میں دیوان یادگار چھوڑے۔

دل ــــ کنہیا لال دل ۔ آپ نے ایک دیوان مرتّب کیا لیکن مکان میں چوری ہوئی اور چور مال و اسباب کے ساتھ آپ کی بیاض بھی لے گئے۔ بہر طور اُن کی چند غزلیں اس وقت تک موجود ہیں۔

مخلص — رائے رایان آنند رام مخلص — صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ "آبِ حیات" میں آپ کا ذکر موجود ہے۔ اس وقت ان کے فقط چار شعر ملتے ہیں

تسلّی — رائے ٹیکا رام تسلّی — "خمخانۂ جاوید" اور عشرت لکھنوی کے تذکرے میں آپ کا کلام موجود ہے۔

رواں — جگت موہن لال رواں — "رُباعیاتِ رواں" آپ کا ایک مشہور و معروف مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک مجموعہ نظم و غزل کا ہے اور ایک مثنوی جس میں مہاتما بدھ کی سوانح حیات نظم کی گئی ہے۔

مدن — پنڈت جانکی ناتھ مدن — آپ نے "فلسفۂ الوہیت" کے نام سے گیتا کا ترجمہ کیا ہے۔

ساحر — امرناتھ ساحر — "کفرِ عشق" آپ کا اُردو کا اور "چراغِ معرفت" فارسی کا دیوان ہے۔ فیضی کی گیتا اور وشنو پُران کا آپ نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

دیوانہ — رائے سرب سنگھ دیوانہ — اُردو اور فارسی کے ممتاز شاعر۔ تین دیوان اُردو کے اور چار فارسی کے آپ کی یادگار ہیں۔

پروانہ — راجہ جسونت سنگھ پروانہ — صاحبِ دیوان تھے لیکن اب اُن کا دیوان نہیں ملتا۔ صرف چند اشعار باقی رہ گئے ہیں۔

صدر — منشی لچھمن پرشاد صدر — "گنجینۂ صدر" اور "رسالۂ غیر منقوط" کے مصنّف آپ کا دیوان "چمنستانِ سخن" کے نام سے شائع ہوا۔

جوہر — مادھورام جوہر۔ منیرؔ شکوہ آبادی کے شاگرد تھے اور اپنے وقت کے مسلّم الثبوت شاعر۔

شعلہ — بنواری لال شعلہ۔ دیوان نایاب ہے غزلیں اور کچھ اشعار موجود ہیں۔

برہمن — چندربھان برہمن — زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

بیدی — راجندر سنگھ بیدی — عہدِ نو کے مشہور افسانہ نگار

اپندر ناتھ — اپندر ناتھ اشک۔ اردو اور ہندی کے نامور افسانہ نگار

کنہیا لال — کنہیا لال کپور — اردو کے منفرد طنز نگار "شیشہ و تیشہ"۔ "سنگ و خشت" اور "نوکِ نشتر" کے مصنّف

مہندر ناتھ — "آدمی اور سکّے"، "نئی بیماری" اور "ہندوستان سے پاکستان تک" کے مصنّف۔

کوشلیا — کوشلیا اشک — عصرِ حاضر کی ایک افسانہ نگار

ساگر — رامانند ساگر — "اور انسان مرگیا" آپ کا ایک مشہور ناول ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے دو ایک مجموعے افسانوں کے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

بلونت — بلونت سنگھ "سنہرا دیس" "تارو پود" "جوا رہا بھاٹا" اور "خدا کی وصیت" وغیرہ کے مصنّف

کرشن چندر — عصرِ حاضر کے معروف ترین افسانہ نگار۔ آپ کی تصانیف کے نام ہر پڑھے لکھے کی زبان پر ہیں۔

ستیارتھی — دیوندر ستیارتھی — ان کتابوں کے مصنف ہیں۔ "میں ہوں خانہ بدوش" "نئے دیوتا" اور "بنسری بجتی رہی" وغیرہ۔

ریوتی — ریوتی سرن شرما — نئے افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت کے مالک

دل — پریم ناتھ دل — "کاغذ کا واسدیو" کے مصنّف

مخمور — مخمور جالندھری — "تلاطم" آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ آپ نے متعدد شہرہ آفاق کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

شاد — نرئش کمار شاد — موجودہ دور کے سب سے کم عمر شاعر۔ "دستک" "فریاد" "بت کدہ" اور "للکار" آپ کی نظموں اور غزلوں کے مجموعے ہیں۔

متّل — گوپال متّل — "دو راہا" آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔

تاجور — تاجور سامری — نظم و نثر کی متعدد کتابوں مثلاً "جب بندھن ٹوٹے" "اکیلا" "دھرتی کے آنسو" وغیرہ کے مصنّف

فکر — فکر تونسوی — شاعر، نقّاد اور طنز نگار۔ "ہیولے" اور "ساتواں شاستر" کے مصنّف۔

مضطر — رام کرشن مضطر گگوڑوی — مصنّفِ "حیات و کائنات"

دُگل — کرتار سنگھ دُگل — افسانوں کے متعدد مجموعوں کے مصنّف

ملّا ــــ آنند نرائن ملّا ــــ اُردو کے کہنہ مشق شاعر۔ "جوئے شیر" آپ کی پچیس برس کی شاعری کا انتخاب ہے۔

پرکاش پنڈت ــــ مُدیرِ شاہراہ۔ "میراث" کے مصنّف اور "سُرخ آنچل" کے مُرتّب۔

رہبر ــــ ہنس راج رہبر۔ "نیا اُفق" آپ کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اور "پریم چند" ایک تنقیدی مطالعہ

شیدا ــــ راجندر ناتھ شیدا۔ مشہور نقّاد۔ "مطالعے اور جائزے" آپ کے مقالات کا مجموعہ ہے۔

کیفی ــــ علّامہ پنڈت برج موہن کیفی ــ اُردو کے بہت بڑے خادم اور بہت بڑے محسن۔ تصانیف:۔ نظم "کلّیاتِ کیفی"۔ نثر "راج دلاری" (ڈراما) "منّتہ رانا" (ناول) "خمسۂ کیفی" جس میں نثر بھی ہے اور نظم بھی۔
